ڈل
کے
پاس

(افسانے)

پشکرناتھ

پہلی بار	جنوری سنہ ۱۹۶۴ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	چار روپے پچاس نئے پیسے
کتابت	ایم۔ اے مستقیم
ناشر	جے۔ آر۔ ہرکشن لال چوپڑہ
مطبع	چاند پریس جموں

پبلشرز: جے آر ہرکشن لعل چوپڑہ

پکہ ڈنگہ جموں

ڈل کے پاس

(افسانے)

پُشکر ناتھ

مصنف کی دیگر کتابیں

۱۔ اندھیرے اُجالے (افسانے)

اس کتاب کو سال ۱۹۶۱ء کی بہترین تصنیف قرار دیتے ہوئے جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز نے مصنف کو مبلغ ایک ہزار روپے کے پہلے انعام سے نوازا ہے۔

۲۔ دشتِ تمنا (ناول)

زیرِ طبع

۳۔ کچے دھاگے (ناول)

زیرِ طبع

۴۔ غبارے (افسانے)

زیرِ طبع

اپنی ماں کے نام

ترتیب

تو نے اور تیرے فرشتوں نے سجائے افلاک

کاکُلِ غم کو مگر میں نے سنوارا تنہا

قیصر

جرم اور ضمیر

اٹھارہ مارچ سنہ ۱۹۹۱ء کو رات کے ٹھیک بارہ بجے جب وہ اپنی کوٹھی نمبر ۵ بلڈنگ کے شمال مشرقی بیڈروم میں سو رہا تھا تو موت کے فرشتے نے اُس کے دروازے پر دستک دی۔ اتفاق سے ابھی ڈائری کا دوسرا ایڈیشن مسودہ انجام پذیر ہوا تھا

"تمہارا نام لالہ گوسائیں داس ہے؟"

"جی مہاراج!"

اُس نے جواب دیا

"تم پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے کنٹریکٹر ہو؟"

"جی مہاراج!"

"تمہارے باپ کا نام ہستری رام داس تھا؟"

" جی مہاراج "

" تو چلو میرے ساتھ آؤ "

" کہاں ؟ "

" دوسری دُنیا میں یعنی یم پوری "

یہ سُن کر اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اِس اندھیرے میں اُسے اپنی بیوی کا چہرہ نظر آیا۔ جو آرام سے اپنے پلنگ پر سو رہی تھی یہ چہرہ جلد ہی غائب ہو گیا۔ اور اُس کی جگہ اُس کے بڑے بیٹے سریش لال کا چہرہ آیا جو انگلینڈ میں انجینئرنگ کی ٹریننگ لے رہا تھا۔

یہ چہرہ بھی اندھیرے میں تحلیل ہو گیا

اور اُس کے دوسرے بیٹے کا چہرہ نمودار ہو گیا۔ جو علی گڑھ یونیورسٹی میں ڈاکٹر بننے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

یہ چہرہ بھی ہٹ گیا

اور اُس کی اکلوتی بیٹی کا بھولا بھالا چہرہ اُبھر آیا جس کی شادی اُس نے پچھلے ہی سال سیٹھ پنچم لال کے تیسرے بیٹے بہاری لال کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے کی تھی۔ اور جس کے جہیز میں اُس نے ایک لاکھ روپے کا چیک بھی شامل کر دیا تھا!

پھر یہ چہرہ بھی ہٹ گیا

اور اُس کے بینک اکاؤنٹ سامنے آ گئے اُس نے اندھیرے ہی میں حساب لگا کر دیکھا کُل اٹھارہ لاکھ تیرے ہزار دو سو دس روپے اور چھتیس

سنے پیسے بنتے ہیں

اس کے بعد یہ کاغذات بھی نظر کے سامنے سے ہٹ گئے اور ایک پھٹی پرانی بینک پاس بک سامنے آگئی پہلے تو وہ اُسے پہچان ہی نہ سکا لیکن غور سے دیکھنے پر پہچان گیا۔ یہ اس کی سنہ ۱۹۵۵ء کی پاس بک تھی جس میں کُل ایک سو پونڈ روپے اور دس آنے جمع تھے۔ اسے وہ بھول ہی گیا تھا۔

پھر سب چیزیں غائب ہو گئیں۔

اور ایک کالا کلوٹا لمبے ناخن ہاتھ سامنے آگیا

دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہاتھ پھیل گیا۔ پھر یہ ہاتھ اس کی گردن کی طرف لپکا اور اس کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی چیخ بلند ہوئی۔

جب اُسے ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک فرشتہ اُس کا ہاتھ تھامے اُسے ایک لق و دق صحرا میں لے جا رہا ہے۔ اوپر سورج کی کرنیں اتنی تیز تھیں کہ اس کی جلد کے اندر گھس آتی تھیں اور نیچے ریت اتنی گرم کہ پاؤں میں چھالے پڑ جاتے تھے۔ چلتے چلتے اُسے ٹھوکر لگی اور وہ نیچے گر گیا

"دیکھ کر کیوں نہیں چلتے؟"

فرشتے نے ڈانٹ پلائی

"پاؤں زخمی ہو گئے ہیں جناب!"

"اگلا پڑاؤ کتنی دور ہوگا؟"

"سات لاکھ میل!"

"تب تو میں واقعی مر جاؤں گا"

"تم اس وقت بھی زندہ نہیں ہو"

"یہاں کوئی ٹیکسی وغیرہ نہیں مل جاتی؟ میری گاڑی تو گیرج میں ہوگی۔"

فرشتے کے ہونٹوں پر معصوم سی مسکراہٹ کھِل اٹھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اچھا آپ پیسوں کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے۔ کوئی بات نہیں پیسے میں دیتا ہوں۔ میں اس طرح پیدل چلنے کا عادی نہیں ہوں۔"

فرشتے کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا

لالہ گوسائیں داس کو شدید غصہ آگیا۔

"عجیب آدمی ہو یار۔ میں مر رہا ہوں اور تم مسکرا رہے ہو۔"

اس کا غصہ دیکھ کر فرشتہ قدرے سنجیدہ ہو گیا اس نے اپنا نورانی ہاتھ پھیلا کر کہا۔

"لاؤ پیسے دے دو ٹیکسی منگواتا ہوں۔"

اس نے جیب ٹٹولی

مگر یہ کیا؟ وہ تو بالکل ننگا تھا۔ اس کے بدن پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ یکایک اس کے چاروں طرف اندھیرے گھر آئے اس نے اس اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا چاہا۔ اس کے چاروں طرف نوٹ ہی نوٹ ہوا میں بکھر بکھر اڑ رہے تھے۔ لیکن اس کے ہاتھ میں ایک بھی نہ آرہا تھا۔ اسے اور غصہ

آگیا اور اندھیرے کی چادریں اور گہری ہوگئیں اُس نے نئے ماڈل کی "ڈاج" اپنے گیرج میں دیکھی اُس کا ڈرائیور اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو پکارا لیکن کوئی جواب نہ ملا اُس نے پھر پکارا اور اس وقت ایک زوردار قہقہے نے اُس کا منہ چڑایا۔

"میں دیکھتا ہوں تمہیں بھی اور تمہارے قہقہے کو بھی"

وہ دہاڑا اور فرشتے کی طرف لپکا

لیکن اس سے پہلے کہ فرشتے کی گردن اُس کے ہاتھ میں آتی وہ چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا اور اُس کے حلق سے چیخ نکل کر صحرا کی لا انتہا وسعتوں میں بکھر گئی۔

"بہت دیر کے بعد اُس نے پھر آنکھ کھولی تو دیکھا دیکھتا ہے کہ سامنے سونے کا ایک نورانی گنبد ہے جس پر کوئی سفید ریش بزرگ ایک موٹی سی مجلد کتاب سامنے رکھے اس کی ورق گردانی کر رہا ہے اور سامنے لوگوں کی ایک لمبی قطار کھڑی ہے فرشتے نے اُس کے کان میں کہا۔ یہی وہ پہلا پڑاؤ ہے یہاں ابتدائی جانچ پڑتال ہوگی۔"

"کس چیز کی جانچ پڑتال؟"

"تمہارے اعمال کی"

"لیکن میں نے کوئی گناہ یا جرم نہیں کیا ہے؟"

"وہ تو کتاب ہی بتائے گی چلو لائن میں کھڑے ہو"

وہ لائن میں کھڑا ہو گیا۔

لائن میں کھڑے کھڑے اُس نے تمام لوگوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی وہ ان میں سے بہت سے آدمیوں سے واقف تھا لیکن کسی نے اُس سے کوئی بات نہ کی۔ شیخ کہیں کے! اُس نے سوچا نہ جانے آج کل لوگوں میں مروت کیوں نہیں رہی ہے اب دیکھو نا وہ جو لائن کے تیسرے نمبر پر کھڑا ہے وہ سردار جسپال سنگھ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا جب میں گورنمنٹ کالج بلڈنگ کا کام کر رہا تھا۔ تو یہ اوورسیئر تھا۔ میں نے اسے پورے ڈھائی ہزار روپے مٹھائی کے لئے دیئے تھے لیکن اس وقت اُس نے دیکھ کر گردن یوں پھیر لی تھی جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔

اور وہ

وہ جو اس کے بعد دسویں نمبر پر ہے، یہ وہی کفن چور کندن لال ریواڑی ہے اگر اُس دن میں اُس کی مدد نہ کرتا تو اب تک یہ دیوالیہ ہو گیا ہوتا۔ نہ جانے کہاں سے ڈیڑھ ہزار بوریاں خارش والا سیمنٹ خرید لایا تھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ ان دنوں مجھے راہ خدا ڈیم کا کام مل گیا تھا۔ اور مجھے سیمنٹ کی ضرورت تھی میں پھر رہا تھا۔ دو ہفتوں کے اندر ڈیڑھ کی ڈیڑھ ہزار بوریاں نکال لایا۔ اب اگر یہی بات اسے یاد دلائی جائے تو کہے گا، لالہ جی! آپ نے بھی تو اس میں چند تیرے ہزار روپے کمائے تھے۔ نامعقول کہیں کا۔ گو سائیں داس تو ویسے بھی کیا لیتا ڈھائی لاکھ کے ٹھیکے میں آدمی تیرے ہزار بھی نہ کمائے تو لعنت بھیجو ایسے کام پر!

اور گوسائیں داس کو تو زیادہ غصہ اُس آدمی پر آرہا تھا جو اُس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اجی حضرت! یہ وہی اُس کے ڈویژن کا اکاؤنٹنٹ ہے۔ لالہ سے ہزاروں روپے کما لئے ہیں اس کم بخت نے۔ ہر بل پر اپنی شرح کے مطابق کمیشن کاٹ لیتا ہے حد ہو گئی۔ کام کوئی کرے اپیسہ کوئی لگائے۔ ٹنڈر کوئی دے اسے اپنے کمیشن سے غرض ہے ابھی۔ آج ہی لیکن آج نہ جانے کونسی تاریخ ہے میرا مطلب ۱۸ مارچ سنہ ۱۹۶۱ء سے ہے۔ جی ہاں آج ہی یہ بلوں پر ایک ہزار نو سو بہتر روپے وصول کر چکا ہے کاروباری سال کا آخری دن تھا نا۔ اس دن تو ان لوگوں کا دماغ آسمان پر ہوتا ہے اس وقت دیکھو۔ میری طرف دیکھتا بھی نہیں کل ہی ڈویژنل انجینیر کے پاس شکایت کروں گا۔ گوسائیں داس نے سوچا۔

ابھی وہ اپنی خیالات میں غرق تھا۔ کہ اس سفید ریش بزرگ کی آواز اس گنبد میں گونج اٹھی۔

"اے انسانو! اگلے پڑاؤ پر تمہارا حافظہ تم لوگوں سے چھین لیا جائے گا۔ تب تک اپنے اعمال کے بارے میں سوچو اور عبادت میں کھو جاؤ اور یہ مت بھولو کہ اب تم زندہ نہیں ہو۔ مر گئے ہو۔ زمین پر تم لوگوں کا کفن دفن ہوئے چالیس دن گزر گئے ہیں!!"

"ہے رام! تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آج مئی کی دس تاریخ ہے"
لالہ گوسائیں داس اس خیال سے چونک پڑا۔
نہ جانے اُس کے بلوں کا کیا ہوا ہو گا اور اُس کا وہ پل تو اب تک

پتھورون لال نے احتجاج کیا۔

یہ آج کی لائن کا پہلا آدمی تھا۔

لالا گوسائیں داس جھلستی دھوپ میں کھڑا سب سن رہا تھا مگر وہ خوش ہو رہا تھا کیوں کہ اس نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا تھا جیسے ان لوگوں نے۔ ایسی کمینہ حرکتیں کیوں کرتے ہیں؟

"پتھورون لال ہندی زالانچہ جہنم کی بدترین بھٹیوں میں جھونک دیا جائے گا!"

سفید ریش بزرگ نے تفصیل بتایا۔

"بہت کڑی سزائیں دیتا ہے کم بخت!"

گوسائیں داس نے سوچا

"دوسرا آدمی ——— کتاب میں لکھا ہے کہ تم یہی گھیو رام انڈوں کا بیوپار کرتے تھے۔"

"جہنم کی بھٹی سرکار!"

"کس قسم کی ملاوٹ کرتے تھے؟"

"ہاہاہاہا ——— کیا پتے ہے سرکار۔ انڈے میں ملاوٹ کیسے ہو سکتی ہے؟"

یہ سن کر سفید ریش بزرگ کو ہنسی آ گئی۔

گوسائیں داس کو بھی ہنسی آ گئی۔

ٹھیکیداری اور انڈوں کا کاروبار اسے ایک ہی جیسے ایماندار پیشے نظر آ رہے تھے۔

پٹھوری لال نے احتجاج کیا۔

یہ آج کی لائن کا پہلا آدمی تھا۔

لالہ گوسائیں داس جھلستی دھوپ میں کھڑا سب سن رہا تھا مگر وہ خوش ہو رہا تھا۔ کیوں کہ انھوں نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا تھا جیسے یہ لوگ۔ ایسی کمینہ حرکتیں کیوں کرتے ہیں؟

"پٹھوری لال ہندی نالائق جہنم کی بہترین بھٹی میں جھونکا دیا جائے گا!"

سفید ریش بزرگ نے چیخ کر بتایا۔

"بہت کڑی سزائیں دیتا ہے کم بخت!"

گوسائیں داس نے سوچا

"دوسرا آدمی ——— کتاب میں لکھا ہے کہ تم یعنی گھسیو رام انڈوں کا بیوپار کرتے تھے۔"

"زندگی بھر سرکار!"

"کس قسم کی ملاوٹ کرتے تھے؟"

"ہاہاہاہا ——— کیا پوچھتے ہیں سرکار۔ انڈے میں ملاوٹ کیسے ہو سکتی ہے؟"

یہ سن کر سفید ریش بزرگ کو ہنسی آ گئی۔

گوسائیں داس کو بھی ہنسی آ گئی۔

ٹھیکیداری اور انڈوں کا کاروبار اسے ایک ہی جیسے ایماندار پیشے نظر آ رہے تھے۔

"اسے دوسرے پڑاؤ پر مزید احکام کے لئے بھیجدیا جائے" سفید ریش بزرگ نے حکم سنایا۔

گوسائیں داس نے اپنے فرشتے سے پوچھا کہ دوسرے پڑاؤ پر اسے کیا کریں گے۔؟ اُس نے جواب دیا کہ دوسرے پڑاؤ پر اسے جنت اصغر کا پاسپورٹ ملے گا۔

"تیسرا آدمی ——— کتاب میں لکھا ہے، تم نے یعنی سیٹھ چنڈال چند نے لوگوں کو دواؤں کے بدلے سادہ پانی اور قیمتی انجکشنوں کے بدلے ڈسٹلڈ واٹر کے ٹیوب فروخت کئے ہیں۔ سادہ پنسلین کی بوتلوں پر قیمتی انجکشنوں کے لیبل لگا کر مہنگے داموں بلیک مارکیٹ میں بیچا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ تم نے اس طریقے پر نو مردوں، گیارہ عورتوں اور چھ بچوں کو قبل از وقت موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔!"

"یہ سب جھوٹ ہے۔ بوگس! کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟" سیٹھ چنڈال چند نے گرج کر کہا۔

"ثبوت کی ضرورت دنیاوی عدالتوں میں پیش آتی ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں نکال کر اور دونوں ہاتھ کاٹ کر شجر ممنوعہ پر الٹا لٹکا دیا جائے اور نیچے آگ جلائی جائے!"

حکم سنایا گیا

"یو سوائن میں تم کو گولی مار دوں گا۔۔ آئی ول کل یو!"

سیٹھ چنڈال چند گلا پھاڑ پھاڑ کے چیخنے لگا۔ مگر دو سپاہی تیار تھے، پہلے

ہوئے موت کے فرشتے اُسے لے گئے۔

لالہ گوسائیں داس نے اطمینان کی سانس لی۔ اِس لئے کہ نہ تو وہ دوا فروش ہی ہے۔ اور نہ اُس نے کسی کو مار ڈالا ہے۔ وہ تو ایک سیدھا سادھا کنڈکٹر ہے۔ گورنمنٹ کے کام کرتا ہے اور پیسے لیتا ہے۔

”یہ چوتھا آدمی ——— تم یعنی سنتوکھ سنگھ نے اپنی عمر میں اکیاون آدمیوں کو مختلف موقعوں پر رشوت دی ہے۔ اور اِس طرح سے خود بھی جرم کیا ہے اور انھیں بھی گنہگار بنا دیا ہے!“

سفید ریش۔ بزرگ نے چوتھے آدمی سے کہا۔

”گیانی جی: تسی جاندے او۔ ہُن رشوت نہ دیئے تے صاحب لوکی چھتر مار کر باہر کڈ دے نے!“

(گیانی جی: آپ جانتے ہیں کہ آجکل رشوت نہ دیں تو صاحب لوگ جوتے مار کر باہر نکال دیتے ہیں!)

چوتھے آدمی نے جواز پیش کیا۔

”ہمیں اِس بات سے کوئی غرض نہیں۔ کہ رشوت دینے سے کیا ہوتا ہے۔ اور کیا نہیں ہوتا ہے۔ اِس لئے حکم ہوتا ہے کہ سنتوکھ سنگھ کے دونوں ہاتھ کاٹ کر صحرا میں چھوڑ دیا جائے!“

یہ سُن کر لالہ گوسائیں داس کے دل کی دھڑکنیں خلط ملط ہو گئیں اُسے خیال آیا کہ اُس نے بھی اپنی زندگی میں ہزاروں روپے لوگوں کو رشوت دیئے ہیں مگر نہیں، رشوت تو کوئی دوسری چیز ہے اُس نے صرف کمیشن

دیا۔ ہیڈ اوورسیروں کو کمیشن، اسسٹنٹ انجینئروں کو کمیشن۔ ڈویژنل انجینئروں کو کمیشن۔ بل پاس کرنے والوں کو کمیشن۔ اکاؤنٹنٹوں کو کمیشن اور جہاں کمیشن نہیں دیا تھا وہاں چائے دی تھی۔ دعوت کھلائی تھی۔ شراب پلائی تھی۔ مٹھائی اور بخشش دی تھی۔ یہ چیزیں تو رشوت ہرگز نہیں ہو سکتیں۔

وہ ابھی ایسی ہی سوچوں میں غرق تھا کہ اس کے فرشتے نے اسے ٹھوکا مارا۔

”چلو نرک میں۔ سمجھا؟ تمہاری باری کل آئے گی۔“

نرک میں داخل ہو کر لالہ گوسائیں داس کے دماغ کی بے کلی بدستور قائم رہی۔ اسے رہ رہ کر سفید ریش بزرگ پر غصہ آ رہا تھا۔ آخر یہ کیا بات ہوئی کہ کسی آدمی کو رشوت دو اور اس پر سزا بھی خود ہی بھگتو۔ مگر وہ خواہ مخواہ ڈر رہا تھا۔ اس نے رشوت نہیں دی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے اسے چند باتوں کا خیال آیا۔ چند معمولی باتوں کا۔ اسے خیال آیا کہ ایک مرتبہ جب وہ جہلم دریا کا پل بنوا رہا تھا تو ایک مزدور کام کرتے کرتے مٹی کے تودے کے نیچے آ کر جان بحق ہو گیا تھا۔ قاعدے کے مطابق اسے اس کے لواحقین کو تین سو روپے ہرجانہ دینا تھا۔ لیکن اس نے ہیرپھیر سے کام لے کر انہیں کچھ بھی نہ دیا تھا۔ لیکن یہ تو معمولی باتیں تھیں۔ کتاب میں ایسی باتوں کا ذکر کہاں ہوگا۔

اسے یہ بھی خیال آیا کہ گورنمنٹ ہسپتال کی نئی بلڈنگ بنانے میں

اُس نے دیودار کی لکڑی استعمال کرنے کی بجائے گھٹیا کیل کی لکڑی استعمال کی تھی اور اس بات کو چھپانے کے لیے ایک انجینئر کو دس ہزار روپے دئے تھے مگر یہ تو کاروباری رموز ہیں بھلا کتاب میں اس واقعہ کا ذکر کیوں آنے لگا۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ اُس نے متعلقہ اسٹاف کو اپنا کمیشن دے کر راہ خدا ڈیم میں ناقص مصالحہ استعمال کیا تھا جس کی وجہ سے وہ مکمل ہونے کے سال بھر بعد ہی کریک ہو گیا تھا۔ مگر یہ بھی کاروبار کی باریکیاں ہیں۔ کتاب میں ان باتوں کا کیا کام۔ کتاب میں وہی باتیں ہوں گی جو ذرا سنجیدہ قسم کی ہوں مثلاً دواؤں میں ملاوٹ، کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ، لوگوں کی جانیں لینا یا رشوت دینا وغیرہ وغیرہ تو یہ تو پاپ ہوگا۔ واقعی گنہگار ہیں انہیں کڑی سے کڑی سزائیں مل جائیں۔ لالہ گوسائیں داس تو ہمیشہ خدا خدا سے ڈرتا رہا ہے۔ وہ ہمیشہ بھگوت بھجن کرتا رہا ہے۔ صبح مندر بھی جایا کرتا تھا۔ اور یہ بات تو وہ بھول ہی گیا تھا کہ ودھوا آشرم کی نئی بلڈنگ کا ٹھیکہ بھی اُسی نے لیا تھا محض اپنے مندر جانے کی عادت کے طفیل اور نہایت دیانتداری سے اس کام کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا یعنی پچاس ہزار کے کام میں صرف نو ہزار کمائے تھے ....

سوچتے سوچتے لالہ گوسائیں داس کو ایک اور بات یاد آگئی نہ جانے آج اُسے باتیں کیوں یاد آ رہی تھیں۔ اُس کا حافظہ تو کبھی تیز نہ تھا۔ ممکن ہے اب تیز ہو گیا ہو۔ اُسے یاد آیا کہ زنانہ کالج کی عمارت میں اس نے سیمنٹ کے کام میں ۷۵ فیصدی سیمنٹ، ۱۵ فیصدی چونا اور ۱۰ فیصدی ریت کی بجائے

ب اور ۵ فیصدی چونا لگایا تھا۔ اور جب با الخیر
تو اُس کا منہ بند کرنے کے لئے اُسے تین

ا میں یہ رقم غلطی سے رشوت کے کالم میں لکھی
وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کاروباری رموز ہیں۔ یہ
فید ریش بڑھا تو نیک نہیں مانتا عجیب آدمی
بخت نے کیا پھر دیا ہے اس کتاب کا
س کو خیال آیا کہ اگر یہ کتاب غائب کر دی
ہے۔ اس کتاب کو غائب ہونا ہی پڑے
ب کو چرا لاؤں گا۔ تاکہ لوگ کری سزا ئل سے
کارڈ تو بالکل صاف ہو گا۔ ہونا ہی چاہئے یہ
میں اس کونے سے اُس کونے تک نظر
ے سب فرشتے اور فرشتہ موت بھی نہ جانے
اور تمام باتوں پر ایک بار پھر غور کر کے بلند تر
گیا۔

ی کو خیال آیا کہ ممکن ہے گنبد میں کوئی فرشتہ
دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟ اگر کوئی دیکھ لے
ے آگیا تھا۔
رت بڑھا۔ گنبد میں کوئی فرشتہ نہ تھا۔ کتاب

گنبد کے بیچوں بیچ سرخ پتھر سے بنے ہوئے میز
بغیر گنبد کی سیڑھیاں طے کیں۔ اسے میز پر رکھی
تھی اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا
اور ایک ہی جھٹکے میں کتاب اٹھا لیا۔ کتاب
کی پچھلی سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ اور ایک
اس کتاب کا کیا کیا جائے؟ اُس کا دل پھر
کہیں فرشتے نے دیکھ لیا تو؟ مگر یہاں کوئی
بار کتاب کھول کے دیکھنا چاہی۔ کتاب کا
اس پر سفید روشنائی سے عبارت لکھی ہو
یہ میں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ اُسے خ
کہاں چھپاؤں؟ یہاں سے بھاگنا تو ناممکن
سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کیوں نہ اس کو
بانس نہ بجے بانسری۔ لیکن کیسے جلایا جا
نہیں اور آگ بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ پھر
جا رہا ہے۔ یکایک اُسے خیال آیا اور
سے نہ قوت ہاتھ نہ۔ کیوں نہ میں اس کتاب
اسے کھا جاؤں گا۔ وقت تو لگے گا لیکن
ہے۔ اور وہ کتاب کا ایک ایک ورق پھ
اُس کے جبڑے دُکھنے لگے۔ اور وہ سوچ

گنبد کے بیچوں بیچ سرخ پتھر سے بنے ہوئے میز پر پڑی تھی اُس نے کوئی آواز پیدا کئے
بغیر گنبد کی سیڑھیاں طے کیں۔ اب میز پہ رکھی ہوئی کتاب اُس کے بالکل سامنے
تھی اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میز کی طرف بڑھا
اور ایک ہی جھٹکے میں کتاب اٹھا لیا۔ کتاب بغل میں دبا کر وہ تیز تیز چلتا ہوا گنبد
کی پچھلی سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا اور ایک جھاڑی میں چھپ کر سوچنے لگا:
اس کتاب کا کیا کیا جائے؟ اُس کا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اگر
کہیں فرشتے نے دیکھ لیا تو؟ مگر یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے ایک
بار کتاب کھول کے دیکھنا چاہی۔ کتاب کا کاغذ گہرے نیلے رنگ کا تھا۔ اور
اس پر سفید روشنائی سے عبارت لکھی ہوئی تھی۔ نیلا رنگ اور سفید روشنائی
یہ میں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ اُسے خیال آیا لیکن؟ اس کتاب کو میں
کہاں چھپاؤں؟ یہاں سے بھاگنا تو ناممکن ہے۔ وہ شدت سے سوچنے لگا۔
سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کیوں نہ اس کتاب کو جلا دیا جائے تاکہ نہ رہے
بانس نہ بجے بانسری۔ لیکن کیسے جلایا جائے؟ ماچس تو اس کے پاس ہے
نہیں اور آگ بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ پھر کیا کیا جائے؟ اتنا وقت نکلا
جا رہا ہے۔ یکایک اُسے خیال آیا اور وہ اچھل پڑا۔ اوہو! میں بھی کتنا
بے وقوف رہا ہوں۔ کیوں نہ میں اس کتاب کو کھا جاؤں؟ ٹھیک ہے میں
اسے کھا جاؤں گا۔ وقت تو لگے گا لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں
ہے۔ اور وہ کتاب کا ایک ایک ورق پھاڑ کر کھانے لگا۔ چباتے چباتے
اُس کے جبڑے دُکھنے لگے۔ اور وہ سوچنے لگا: کاش وہ ایک گدھا ہوتا

تاکہ کتاب چھپانے میں اسے سہولیت رہتی۔

بصرہ بلڈنگ کے شمال مشرقی بیڈروم میں لگے ہوئے کلاک نے دس بجائے۔ بیڈروم کی کھڑکیوں سے سورج کی کرنیں کمرے میں داخل ہو کر کمرے کی دلکشی اور ڈیزائن میں چار چاند لگا رہی تھیں۔ اتنے میں مسز گوسائیں داس نے بیڈروم کا دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہو گئیں۔

اندر داخل ہوتے ہی اُس کے حلق سے ایک بلند چیخ نکلی اور بصرہ بلڈنگ کے گوشے گوشے میں گونج اٹھی۔

سامنے لالہ گوسائیں داس کرزہ بکر خوب صورت قالین پر بے ہوش پڑا تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اور دراہ خلا ڈیم کے بلیو پرنٹ اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ جن میں سے کچھ اُس نے چبا چبا کر پھینک دیئے تھے کچھ اُس کے منہ میں تھے اور کچھ ہاتھ میں!

باہر ملک کے تیسرے پنج سالہ منصوبے کا آغاز ہو گیا تھا۔ ●●

صُبح کا بُھولا

نہ جانے کب آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا تھا اور روشنی کی ایک لکیر سی بناتا میرے دل کے نرم گرم گوشوں میں چھپ گیا تھا میرے ذہن میں ایسی کوئی بھی تصویر نہیں جس کی نوک پلک میں نے سنواری ہو اور جسے بڑے اہتمام کے ساتھ میں نے اپنے دل کے منقش طاق پر کسی سنہرے فریم میں سجایا ہو۔ اب اگر سارا گھوش یہ سمجھتی ہے کہ وہ تین سال سے مسلسل مجھ سے محبت کرتی آئی ہے تو میں جھٹلانے جاؤں تو کیا کروں!

سارا گھوش بالکل جھوٹ کہتی ہے میں اس کی بات کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا مگر ٹھہریئے میں آپ کو ساری بات ہی کیوں نہ بتا دوں۔

میں جیون داس مرلی داس کمپنی ہول سیل ڈرگسٹس اینڈ کیمسٹس نامی فرم میں کام کرتا تھا۔ کام کیا کرتا تھا پارٹ ٹائم کام کرتا تھا۔ یعنی شام کو دو گھنٹے اُن کی فرم میں یہ بکنگ کرتا اور مہینے کی پہلی تاریخ کو پانچ سو روپے کا چیک حاصل

کرتا تھا۔ اس کے علاوہ میرا اس فرم کے ساتھ کوئی سروکار نہ تھا۔ بالکل کوئی سروکار نہ تھا۔ اور یہ بات اس لئے دوہرانا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ پچھلے دنوں جو اخباروں میں خبریں آئی تھیں۔ کہ جیون داس مرچنٹ داس کمپنی نقلی دوائیاں فروخت کرتی ہے۔ اور ہندوستانی امپورٹ پر ولایتی لیبل لگا کر منہ مانگے داموں پر فروخت کرتی ہے اُن کی روشنی میں آپ مجھے غلط نہ سمجھ بیٹھیں۔ میرا کام تو مریض کو دیکھ کر نسخہ لکھ دینا تھا۔ سارا گھوش کا کام ان نسخوں کو رجسٹر میں درج کرنا تھا۔ اور دوائیں بنانے کا کام کمپنی کا ایک پارٹنر جیون داس خود کیا کرتا تھا یہ میری عادت ہے کہ بات کو پہلے ہی واضح کر دیتا ہوں یہ نہیں کہ سارا گھوش جی کی طرح کسی اشارے سے کام نہ لوں کوئی وضاحت ضروری نہ سمجھوں اور تین سال کے بعد یعنی غور کرنے والی بات ہے پورے تین سال کے بعد یہ کہوں کہ میں آپ سے مسلسل محبت کرتی آئی ہوں

بالکل جھوٹ بولتی ہے یہ لڑکی!

سوچنے کی بات ہے۔

یعنی میں بالکل انکار بھی نہیں کرتا کہ میں سارا گھوش کو پچھلے تین سال سے نہیں جانتا جس دن میں پہلی بار جیون داس مرچنٹ داس کمپنی میں کام کرنے کی غرض سے گیا تھا۔ تو سب سے پہلے سارا گھوش کی مسکراہٹ ہی نے میرا خیر مقدم کیا تھا میں نے پہلی ہی نظر میں دیکھا کہ سارا گھوش ایک خوبصورت لڑکی ہے۔ اس کے باوجود کہ اس کے لمبے لمبے بال کمر تک لہراتے چلے گئے ہیں اور اس کے نازک ہونٹوں پر کوئی لپ اسٹک وغیرہ نہیں جچی ہے۔ اور اس کے باوجود کہ اس کی آنکھیں بڑی روشن اور گہری ہیں۔ اور اس کے سڈول بدن،

میں ایک توازن ہے یعنی ان تمام باتوں کے باوجود سارا گھوش مجھے خوبصورت نظر آئی تھی حالانکہ آج کل خوبصورتی کے معیار یکسر بدل گئے ہیں آج کل ایبسٹریکٹ آرٹ کا زمانہ ہے اور ایسی لڑکی کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے کہ جس کے بال پاشم بھرے ہوں۔ جس کے ہونٹ گہرے رنگ کی لپ اسٹک سے ٹیڑھے میڑھے بن گئے ہوں جن کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے تیر رہے ہوں جنہوں نے ایسے کپڑے پہن لئے ہوں جن سے جسم میں ایک غیر متوازن کیفیت پیدا ہو گئی ہو اور جس کے دانت مسلسل سگرٹ نوشی اور مسلسل چیونگ گم چبانے سے بے رونق بن گئے ہوں اور مسوڑوں سے اکھڑے ہوئے نظر آ رہے ہوں۔

سارا گھوش ان تمام نزاکتوں اور لطافتوں سے محروم تھی پھر بھی وہ مجھے خوبصورت نظر آئی تھی۔ دراصل اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے اس خون کا ہے جو میری سیدھی سادی ماں کی شریانوں سے مجھ میں سرایت کر گیا ہے۔ ورنہ میں نے چار سال ولایت اور ایک ماہ اسٹیٹس میں رہ کر خوب اپنے آپ کو ریفارم کیا ہے۔

سارا گھوش کا کہنا ہے کہ اسے پہلے ہی دن مجھ سے محبت ہو گئی تھی یہ بات بھی غلط ہے کیوں کہ جب میں پہلی بار اپنی میز پر بیٹھ کر مریضوں کو دیکھنے لگا۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ برابر مجھے گھور رہی ہے۔ بالکل ایسے جیسے ایک شرمیلا بچہ کوک سے چلنے والے کسی جاپانی کھلونے کو دیکھ رہا ہو اور کھلونے کو دیکھ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک رنگ سا آتا ہو اور ایک

جاتا ہو۔ اُس کے ہاتھوں کے کونے رُک رُک کر تھرتھراتے ہوں جب اب سب مریضوں کو دیکھ کر جانے لگا تو میں نے مسز جیون داس کے ساتھ ہاتھ ملانے کو اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر خالص انڈین طریقے سے نمستے کہی۔

"ڈیل میں ــــ؟"

"گھوش ــــ سارا گھوش ــــ!"

اُس نے شرما شرما کر دھیرے سے کہا

"اچھا میں گھوش کل تک کے لئے اجازت ــــ"

میں نے کہا اور دوکان سے باہر آگیا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اتنی سی بات میں محبت کہاں سے آگئی؟ دراصل میں اُسی دن سمجھ گیا تھا کہ سارا گھوش مجھے ناحق خوبصورت لگتی ہے۔ کیوں کہ کسی لڑکی کا اتنا شرمانا اس کی بدصورتی کی دلیل ہے۔ حسینی بالکل نہیں شرمائی تھی جب میں پہلی بار اسے فرانس [illegible] ملا تھا جس نے صرف آدھ گھنٹہ کی ملاقات کے بعد ہی مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ اِن ولایتی لڑکیوں کی بات ہی اور ہے جب ہی اپنے انڈیا کے تقریباً سارے امیر لڑکے ولایتی یا امریکن لڑکیوں سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اور تقریباً ساری دولت مند لڑکیاں کسی ہیرو یا جیمز کسی ڈیوڈ یا ڈالر کے خواب دیکھتی ہیں۔ خیر اس بات کو جانے دیجیے بات سارا گھوش کی ہو رہی ہے۔

مجھے پریکٹس کرتے ہوئے کئی مہینے گزر گئے اور اس دوران میں مسز ا اندر سارا گھوش کی بات چیت چند رسمی جملوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ آخر ایک دن جب میرے سامنے کوئی مریض نہ تھا اور ابھی آدھ گھنٹہ مجھے اور بیٹھنا تھا اور مسٹر مرلی داس دکان کے پیچھے اندر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا تو میں نے خاموشی سے اکتا کر سارا گھوش کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ شروع کیا۔

"مس گھوش کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا

"کچھ بھی نہیں مسٹر گوتم بس بیٹھی ہوں"

"تمہارا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے؟" میں نے پوچھا

"جی نہیں۔ ابھی ذرا کم ہی یہ سلسلہ ہندوستان میں چلتا ہے۔"

"ویری گڈ! اچھا یہ بتاؤ تمہارا کوئی ڈیٹ تو نہیں آج؟"

"ڈاکٹر! آپ اپنی شرم شاید ولایت میں بھول آئے ہیں:" اس نے غصے سے کہا۔

"کیوں کیا ہو گیا۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے؟"

میں نے حیران ہو کر پوچھا

لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا صرف برہم نگاہوں سے مجھے چند لمحوں تک دیکھتی رہی اور اس کے بعد اُٹھ کر دوکان کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔ میں نے سوچا یہ لڑکی ضرور پاگل ہے آخر میں نے ایسی کون سی

سے لگی تھی جیسے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ بات کو ختم کرنے
کیلئے میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں نے اس بات کا ذکر ہی اپنی محبوبہ سے کیوں کیا
"مگر تم کو کیا ہو گیا ہے تم کیوں ایسی لڑکیوں کے ساتھ عشق کرتے ہو؟
ہندوستانی لڑکیاں ان باتوں کو کیا جانتی ہیں۔"

"تمہیں کیا معلوم تم بھی تو ہندوستانی لڑکی ہو۔ تم برا کیوں نہیں مانتیں؟"

میں نے معصومیت سے پوچھا

"میری بات اور ہے ڈارلنگ۔ میری سطح پر پہنچتے پہنچتے ان لڑکیوں
کو کئی سال لگیں گے۔ وہ بولی۔ مگر میری خاطر خواہ رہی تو"

تب میں نے کہا۔

اور یہ بات مجھے ٹھیک بھی نظر آئی۔ دوسرے دن میں نے سارا گوش
سے متعلق انگلینڈ اور جنیوا کی اس کے ساتھ ایسی باتیں کہا تھا مگر سوال پیدا
ہوتا ہے کہ سارا گوش کو مجھ سے محبت کیسے ہو گئی۔ اس کا کہنا ہے کہ میں تو
پہلا نوجوان تھا جس میں اسے کچھ دلچسپی نظر آئی تھی اور یہی دلچسپی جب
شاید یہ صورت اختیار کر گئی۔ تو محبت بن گئی۔ لیکن میں نے محبت کرنے کے
ڈھنگ سیکھے ہیں۔ یہ بات اس سے کتنی مختلف ہے کہ اپنے انڈیا کی
لڑکیوں کو تو محبت کرنا بھی نہیں آتا۔

تو سنیے کہ جب میں چند دنوں کے لئے بیمار ہو گیا تو اور لوگوں کے
علاوہ سارا گوش بھی مجھے دیکھنے کے لئے آگئی تھی۔ اور ڈاکٹر کے بجائے کہ
گھڑی دو گھڑی کے لئے میرا دل بہلاتی اس نے مجھے اور بیمار کر دیا۔ اس کے

ہاتھوں میں کوئی گلدستہ تھا۔ اور نہ میرے لئے کچھ دلچسپ انگریزی رسالے اپنا لائی تھی۔ خالی ہاتھوں ہی آگئی اور میرے بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی

" اب کیسی طبیعت ہے آپ کی مسٹر گوتم ؟ "

" بس بیمار ہوں سارا۔ "

میں نے بستر پر پڑے پڑے ہی جواب دیا۔

اور فوراً ہی مجھے محسوس ہوا کہ میری زبان سے اپنا نام سن کر وہ شرما گئی۔ اتنا ہی نہیں اس نے میرے ماتھے پر یوڈی کلون بھی نہیں لگایا اور نہ کچھ لطیفے سنا کر میرا دل ہی بہلایا۔ بلکہ ایسے منہ پھلائے بیٹھی رہی جیسے بیمار میں نہیں وہ خود ہو۔ دستور تو یہ ہے کہ بیمار کے ساتھ کچھ میٹھی میٹھی باتیں کر کے اس کا دل بہلاؤ۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کچھ رومانس کی فضا قائم کرو تاکہ بیمار کا دل بہل جائے۔ لیکن سارا گھوش بس میرے سامنے بیٹھی رہی اور اپنی انگلی کے گرد اپنی ساڑی کا پلو لپیٹتی رہی۔ شاید یہ دکھ بانٹنے کی کوئی علامت ہو۔ لیکن ایسی علامتیں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں

تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلی گئی۔

" میں جذبۂ محبت کے تحت ہی آگئی تھی۔ "

وہ لکھتی ہے

" مائی فرینڈ "

لکھتی ہے

" تمہارے سینہ میں دل کی جگہ پتھر کی سل ہے۔ "

کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ اب آپ ہی کہیے کہ یہ بات سچ کیسے ہو سکتی ہے؟ اب سارا گھوش کو کون بتلائے کہ اُس دن مجھے اُس پہ کتنا ترس آیا تھا جب میں اُسے پہلی بار اپنے ساتھ کلب لے گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک دن مجھے خیال آیا کہ سارا گھوش بہت تنہا ہے اُس کی زندگی بے رنگ اور ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سوچا میں اسے اپنے ساتھ کلب لے جاؤں گا۔ اور اُس دن جب میں جیون داس مرن داس کمپنی میں اپنی ڈیوٹی ختم کر چکا تو میں نے اُس سے کہا "مس گھوش! تمہاری ڈیوٹی ختم ہو گئی نا۔؟"

"ہاں ڈاکٹر! مگر آپ کیوں پوچھتے ہیں۔؟"

"اگر تم برا نہ مانو تو میں آج کی شام تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں!"

"یعنی ——— ؟"

"یعنی یہ کہ ہم کسی جگہ بیٹھ کر تھوڑی سی کافی پئیں اور بہت سی باتیں کریں"

"زیادہ دیر تو نہیں ہو جائے گی؟"

"نہیں بس یہی کوئی گھنٹہ بھر دیر سے گھر پہنچو گی۔"

اُس نے کچھ نہیں کہا۔

اور میرے ساتھ آ کر کار میں بیٹھ گئی۔ میں اُسے کلب لے گیا ایک خالی کونے میں بیٹھ کر میں نے کافی کا آرڈر دیا۔ لیکن باتیں نہ ہو سکیں۔ وہ گم سُم ہی بیٹھی رہی اور دُزدیدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی رہی جو اور بہت کچھ رنگ ڈانس کر رہے تھے۔

"یہ سب لوگ شادی شدہ ہیں میرا مطلب ہے یہ سب عورتیں ان مردوں کی بیویاں ہیں جن کے ساتھ یہ ناچ رہی ہیں؟"

اُس نے سرگوشی میں پوچھا

"نہیں، کچھ شادی شدہ ہیں۔ کچھ کنوارے ہیں۔"

"پھر ایک دوسرے کے ساتھ کیسے ناچ رہے ہیں۔؟"

کیوں اس میں کیا بات ہے؟ ہم سب لوگ یہاں فرینڈس ہی تو ہیں۔"

اُس کے ہونٹوں کے ناخن سے بدل گئے اُس کے ماتھے پر تیوریاں چڑھ گئیں۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر ہنسی آگئی۔ اور اُسی وقت مسز جیپ والا کی نظر ہم پر پڑ گئی۔

"ہلو گوتم ڈیئر!"

اُس نے آواز دی۔

"ہلو سوئیٹی!"

"تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ آؤ فلور پر۔ یہ کون ہے؟"

میں نے اُس کا تعارف کرایا۔

مسز جیپ والا نے مجھے ایک طرف لے جا کر ڈانٹا

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے گوتم؟ اِس دیہاتن میں آخر تمہیں کیا نظر آیا؟ بائی گاڈ نِری پلین لڑکی ہے!"

مجھے مسز جیپ والا کی اس بات پر سخت غصہ آیا آخر اُسے یہ کیسی

کو ذلیل کرنے کا کیا حق ہے بے چاری سارا گھوش بے شک پلین ہے۔
لیکن کیا کہ اسے کلب میں دیکھ کر لوگ بندروں کی طرح منہ بنائیں اس وقت
تو یہ میری ٹریجڈی ہے اور میری فرینڈ کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا
اور سب مجھے بے چاری سارا گھوش پر بے حد ترس آیا لیکن اس کا یہ مطلب
نہیں مجھے اس سے بے حد محبت ہو گئی ہے۔

غور کیجئے مجھے جس لڑکی نے اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا ہو کبھی
کوئی ڈیٹ نہ دی ہو کبھی میرے ساتھ کوئی رومانس کی بات نہ کی ہو اور وہ یہ
دعویٰ کرتی ہے کہ اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ اب یہی دیکھئے مجھے
اس سبرب میں رہتے ہوئے پورے دس مہینے ہو گئے ہیں لیکن
آج سے پہلے اس کا کوئی خط تک نہیں آیا

مگر ٹھہریئے میں بیچ کا ایک واقعہ آپکو بتانا بھول ہی گیا چاہئے تو
یہ تھا کہ میں پہلے ہی اس بات کی وضاحت کرتا۔ خیر بات یہ ہے کہ جیون
داس۔ جیون داس کمپنی میں دو سال کام کرنے کے بعد مجھے اس گندے
سبرب میں میڈیکل آفیسر بنا کر بھیج دیا گیا ہے اور یہاں میں پورے دس
مہینے سے پڑا ہوں۔ یہاں نہ کوئی کلب ہے نہ سینما ہے نہ ڈھنگ
کے مریض ہی ہیں میں تنگ آگیا ہوں۔ یہاں پڑھے پڑھے جدھر دیکھتا
دھوتی اور کرتا ہی نظر آتا ہے کوئی بھی چارمنگ سین نہیں۔ یہاں صرف
میں ہی کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ اس لئے تنگ آکر اب انتقام کے طور پر
دھوتی اور کرتا پہننا شروع کر دیا ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہاں

کی ساری لڑکیاں ساراگوش نظر آتی ہیں۔ میں نے یہاں آکر ساراگوش کے بارے میں سوچا ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں ساراگوش میں دلچسپی لینے لگا ہوں۔

اب دیکھئے جس دن میں یہاں آیا اس سے ایک دن پہلے ساراگوش میرے ساتھ کلب آئی تھی۔ گم سم سی بیٹھی رہی میں نے اس کا دل بہلانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ بجھی بجھی سی رہی لوٹتے ہوئے میں نے راستے کی روشنی میں دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بھیگی سی لگ رہی تھیں۔ بس اس بات سے مجھے چڑ ہے سارا جیسی لڑکیاں روتی زیادہ ہیں اور محبت کم کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ یہ چند سارا کی چٹھی میرے سامنے ہے اور جس کی چند سطریں ابھی تک پڑھ سکا ہوں اس پر بھی جگہ جگہ آنسوؤں کے نشان ہیں۔

لکھتی ہے۔

"یہ میرا پہلا خط ہے جو میں نے اس موضوع پر لکھا ہے اور شاید آخری بھی لکھتی ہے تمہارے جیسے آدمیوں سے مجھے شدید نفرت ہے لیکن کوشش کے باوجود میں اپنے دل میں تمہارے لئے کوئی نفرت کا جذبہ نہ ابھار سکی تم وہ پہلے آدمی ہو جس سے مجھے محبت ہو گئی ہے! اور تم ہی وہ آخری آدمی ہو جس کی محبت کو سینے سے لگائے میں مر جاؤں گی۔" تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے آدمی سے محبت نہیں کرے گی۔ یعنی اپنے ہونے والے ہسبنڈ کے ساتھ بھی نہیں کرے گی؟

واشنگٹن سویڈ گرل!

اب میری ہی بات لیجیے۔ میں نے اب تک نہ جانے کتنی لڑکیوں سے محبت کی ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اپنی ہونے والی وائف کے ساتھ محبت نہ کروں۔ وائف!

مگر سارا گھوش؟ آخر وہ کیوں کہتی ہے کہ اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ مجھے اس بات پر غور کرنا پڑے گا کہ کیوں نہ ایسا چھوٹا سا خط لکھنے والے کو قانون کے حوالے کیا جائے؟

مگر... مگر یہ بیچ میں شادی کی بات کیوں آگئی؟ کہیں یہ بات تو نہیں کہ سارا گھوش کو مجھ سے اس لیے محبت ہو گئی ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے؟ اُف، میں کتنا بے وقوف ہوں۔ ڈیم اٹ! ڈیم فول!

مجھے چاہیے تھا کہ ابتدا ہی سے اس سارے معاملہ کو اس پس منظر میں جانچتا۔ مگر میں کیا کروں؟ بس، ایسی باتوں کی تربیت ہی ایسے کلبوں یا ایسے سرکلوں میں ملی ہے جہاں لڑکے اور لڑکیاں شادی اور ایسی ہی دوسری باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتیں۔ اپنی گرل فرینڈ کو سینما لے جاؤ۔ اُن کے ساتھ کلبوں میں ڈانس کرو۔ اُن کے ساتھ رومانس کرو۔ مگر شادی کا لفظ تک زبان پر نہ لاؤ۔ اپنے بوائے فرینڈ کے تحفے قبول کرو۔ اُن کے ساتھ بیئر پیو۔ اُس کی دست درازیاں تک برداشت کرو۔ مگر شادی کی بات نہ سنو۔ نہ کہو۔ اور نہ دیکھو۔

اب جب مجھے خیال آتا ہے۔ تو بہت سی ایسی باتیں ضرور ہیں جن

کی روشنی میں سارا گھوش کا یہ خط دوسرے معنی رکھتا ہے۔

بے چاری سارا گھوش کا کوئی قصور نہیں۔ اُس نے ضرور کچھ میری آنکھوں میں پڑھ لیا ہوگا۔ اُس نے میرے کسی انداز سے کچھ بھانپ لیا ہوگا۔ اب اُس دن جب ماں کا خط آیا تھا۔ اور جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں اُسے بہو تلاش کرنے میں مدد دوں تو میں جیون داس مرن داس کمپنی میں بیٹھے بیٹھے دیر تک سارا گھوش کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ کیوں؟

اور جیسا میں کہتا ہوں کہ مجھے اُس کی حالت پر ترس آتا تھا تو یہ ترس ہرگز نہ تھا۔ تب کیا میں ایسا ڈاکٹر ہوں جسے اپنی نفسیات کا کوئی علم نہیں۔؟

اور وہ جو کبھی سارا گھوش کی یاد آجاتی۔ تو میں اپنے گھر کے بارے میں سوچنے لگتا تھا جہاں میری ماں اکیلی رہتی ہے۔ اور جس کے آنگن میں تلسی کا ایک پودا ہے، تو ——— تو

اور وہ جو کسی شام کو اچانک کوئی لڑکی دیکھ کر مجھے سارا گھوش کے لمبے لمبے بالوں کا خیال آتا تھا۔ اور میں یہ چاہنے لگتا تھا۔ کہ ان بالوں کو چھو کر دیکھوں تو وہ کون سا جذبہ تھا۔؟ اب جو میں سوچنے لگا ہوں تو مجھے تھوڑا سوچنے دیجیے۔

ابھی مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔ مجھے انڈین بریڈ شاہ دیکھ کر یہ دریافت کرنا ہے کہ شہر جانے والی ریل گاڑی کب چھوٹتی ہے۔ اُس کے بعد شہر جاکر جیون داس مرن داس کمپنی میں سارا گھوش سے ملنا ہے اور اُس

...نے کہا ہے کہ تم نے اپنے خط میں بالکل غلط بیانی سے کام لیا ہے تمہارا یہ کہنا کہ تم پچھلے تین سال سے مجھ سے محبت کرتی رہی ہو ـــ بالکل جھوٹ ہے حقیقت یہ ہے کہ پچھلے تین سال سے غیر شعوری طور پر میں خود تم سے محبت کرتا رہا ہوں ـــــ

تمہاری خوشبو سے محبت کرتا رہا ہوں۔

تمہاری سادگی اور معصومیت سے محبت کرتا رہا ہوں۔

تمہاری محبت سے محبت کرتا رہا ہوں۔

میں اس کے ساتھ اور کون کون سی باتیں کرونگا وہ آپ کو بتانے کی بات نہیں۔

رہ گئی اس خط کی بات ـــــ

تو آپ ہی بتائیے کہ حالات کے اس نئے موڑ کے پیش نظر میں آپ کو اس کا باقی حصہ کیسے سنا سکتا ہوں ـــ؟

ڈل کے باسی

خوشی کا ننھا اس کی چھاتیوں سے دودھ نچوڑتے نچوڑتے تھک ہار گیا اور تھک کر سو گیا۔ خورشی نے جلدی جلدی اُسے ناؤ میں بچھے ہوئے چٹائی کے ایک ٹکڑے پر سلا دیا اور خود کھڑی ہو گئی۔ کھڑے کھڑے اُس نے جھیل کے چاروں طرف دور دور تک نگاہیں پھیلا دیں۔ باقی مچھیرے اپنی اپنی ناؤ کے سرے پر نارڑ لئے پانی کی گہرائیوں میں نظریں گاڑے چپ چاپ بتوں کی طرح کھڑے تھے۔ کبھی کسی کا نارڑ یکا یک سخت حرکت میں آتا اور سرے لگے کوئی مچھلی لہرا کر تڑپتی نظر آتی۔ اور کسی کے ہونٹوں پر ایک ناکامی کے لئے ہلتی جھلک اُٹھتی۔ اور پھر سکوت چھا جاتا۔ خورشی تھوڑی دیر ان کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس نے سوچا یہ کام کتنا صبر آزما ہے۔ مچھیرے کو مچھلی کے انتظار میں کھڑے کھڑے بہت وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ناگاہ

میں جیسی ویسی اُلجھن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ پاؤں تلے زمین سرکنے لگتی ہے، بیکل ہو جاتے ہیں، آنکھیں گہرائیوں میں تلاشتے تلاشتے پتھرا جاتی ہیں اور بہت انتظار کرتے کرتے ٹوٹ سی جاتی ہے۔ لیکن آدمی اس کے باوجود چپ چاپ کھڑا ہی رہتا ہے کیونکہ انہی وقت نہ جانے کیوں شام کا خیال آتا ہے۔ چولہے کا خیال آتا ہے، بچوں کا خیال آتا ہے اور آدمی شدت سے چاہنے لگتا ہے۔ کاش کوئی مچھلی نظر آئے۔ ایک ننھی مچھلی، تاکہ نیزہ اپنا وار کرے اور بچوں کی آنکھ، پاؤں کی بے چینی اور نگاہوں کا سکوت سب اُوپر اٹھنے کے لئے بیتاب رہے۔

اس نے جلدی سے اپنا نیزہ سنبھالا۔ اور ناؤ کے سرے پر کھڑی ہو گئی اور پھر ساکت کھڑی رہ گئی۔ اس کی نظریں جھیل کی گہرائیوں پر جم گئیں۔ جھیل کی گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے، پانی کی تمام نیلاہٹ اس کی پتلیوں میں بکھر گئی۔ جھیل کی تہہ میں کائی کے آس پاس آتی مچھلیاں تیرتی نظر آئیں۔ وہ چاہنے لگی کہ کوئی مچھلی ذرا سی دیر کے لئے تھوڑی سی ابھر آئے تو وہ اپنا نیزہ اس کے جسم میں گھونپ دے اور اسے اٹھا کر کشتی میں ڈال دے لیکن ان مچھیروں کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ سب اوپر والے کی مرضی پر منحصر ہے۔

جھیل میں جھانکتے جھانکتے خورشی کو پانی کی شفاف سطح پر اپنی صورت بھی دکھائی دی۔ اپنی صورت دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے رک سی گئی، ٹھہر سی گئی۔ وہ پھر اپنی صورت کو دیکھنے لگی۔ جو پانی کی شفاف سطح پر

پر تھرک رہی تھی۔ اس نے دیکھا اس کے سر پر بندھی ہوئی اوڑھنی کھسک کر سر کے اوپر پیچھے ہوئی ہے۔ اس نے جلدی سے اوڑھنی کھول کر پھر سے باندھ لی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے بال سورج کی روشنی سے چمک اٹھے اور ان کی چمک نے لہروں میں اتنی خیرگی پیدا کر دی کہ اسے ٹھوڑی کے پاس کا وہ تل بھی اس پانی میں نظر آیا اور اس نے غیر ارادی طور پر اسے بائیں ہاتھ کی انگلی سے چھو کر دیکھا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے گالوں پر لالی بکھر گئی۔ اور اس کا عکس پانی میں بھی تھرک گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے شرما گئی۔ کہیں دیکھا تو نہیں کسی نے؟ اس نے جھیل کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ سبھی اپنے اپنے کام میں لگے تھے۔ یہاں فرصت ہی کسے تھی؟ جو خورشی کی ٹھوڑی کے تل کو دیکھتا۔ سبھوں کو اپنے بچوں کی، ماں باپ کی، بیویوں کی فکر تھی۔ سبھی یہ چاہتے تھے کہ کہیں سے چار چھ مچھلیاں ہاتھ لگیں تاکہ شام کو چولہا جلے۔ دن یوں ہی ہاتھ پڑی۔ بہت دیر سے سے۔ اور ایسا کرتے ہوئے اسے پانی میں اپنے چمکتے ہوئے دانت دکھائی دیئے۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنے دانتوں پر زبان پھیری۔

اسی وقت ایک مچھلی نے جیسے کروٹ سی لی۔ خورشی کو اس کا پیلا پیٹ دکھائی دیا۔ یک لخت اس کا تار اچھلا — ایک چھپاکا ہوا۔ پانی میں دائرے بن گئے۔ ایک ہاتھ لپکا — اور دوسرے لمحے وہ مچھلی خورشی کی ناؤ میں تڑپ رہی تھی۔ اس نے مچھلی کو چیل کے جھپٹنے سے بچانے کے لیے چٹائی کے نیچے چھپا دیا۔

سے ٹھہری تھیں۔ جیسے وہ اپنے آپ کو مچھلیوں کے اس زمرے سے الگ رکھنا چاہتی ہو۔ جو ایک ساتھی کی کمی کو محسوس نہیں کرتی تھیں۔ — سطح پہ ابھرتے اپنا چہرہ تھرتھراتا ہوا دکھائی دیا —

اور اچانک ہی اس چہرے کے ساتھ دوسرا عکس بھی کہیں سے آ کر ابھرنے لگا — وہ ٹھٹک سی گئی۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا تو سامنے ایک مچھیرا اپنی ناؤ کے سرے پر ہاتھ میں ناریل لئے کھڑا تھا۔ اور دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔ خورشی کا جوان چہرہ لالیوں سے بھر گیا

"کچھ ملا — ؟" مچھیرے نے پوچھا

"تھوڑا بہت !" خورشی نے بے رخی سے جواب دیا۔ آدمی اب بھی مسکرائے جا رہا تھا جانے کیوں ؟ اس کے دانت سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

"میں کچھ مدد کروں ؟" اس نے پھر کہا اور اس کے چہرے پر یہ کہتے کہتے ایک دلکش تناؤ سا آ گیا۔

"کیوں ؟ — میرے بھی ہاتھ پاؤں ہیں" خورشی نے تلخی سے جواب دیا۔ اسے مچھیرے کی یہ ہنسی بہت بری معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اسے کوسا "دیدے پھوٹ پڑیں تمہارے —" مچھیرے نے اپنی ناؤ ہلکے سے آگے بڑھا دی اور خورشی نے دیکھا اس کی ناؤ میں بہت سی مچھلیاں ہیں۔ اس کی آنکھوں سے ایک عجیب کم مائگی کا احساس جھلکنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا یہ آدمی بڑا قابل ماہی گیر نظر آتا ہے ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ آدمی نے جاتے جاتے کہا

"اللہ کی قسم ! ڈل جھیل سے بھی زیادہ اچھی ہو — !"

خورشی کو غصہ ہی تو آ گیا "جانے کیا سمجھا ہے مجھے ہنہ !" اور

سے تیر رہی تھیں جیسے وہ اپنے آپ کو مچھلیوں کے اس جھرمٹ سے الگ رکھنا چاہتی ہو۔ جو ایک ساتھی کی کمی کو محسوس نہیں کرتی تھیں۔ — سطح پر پھر سے اپنا چہرہ ابھرتا ہوا دکھائی دیا —

اور اچانک ہی اس چہرے کے ساتھ دوسرا عکس بھی کہیں سے آکر ابھرنے لگا۔ — وہ ٹھٹک سی گئی۔ اس نے نظر اٹھا کے دیکھا تو سامنے ایک مچھیرا اپنی ناؤ کے سرے پر ہاتھ میں ناریل لیے کھڑا تھا۔ اور دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔ خورشی کا جوان چہرہ لالیوں سے بھر گیا

"کچھ کھویا ہے؟" مچھیرے نے پوچھا

"تھوڑا بہت!" خورشی نے بے رخی سے جواب دیا۔ آدمی اب بھی مسکرائے جا رہا تھا جانے کیوں؟ اس کے دانت سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔

"میں کچھ مدد کروں؟" اس نے پھر کہا اور اس کے چہرے پر یہ کہتے کہتے ایک ناخوش تناؤ سا آگیا۔

"کیوں؟ — میرے بھی ہاتھ پاؤں ہیں" خورشی نے تلخی سے جواب دیا۔ اسے مچھیرے کی یہ ہنسی بہت بری معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اسے کوسا، دیدے پھوٹ پڑیں تمہارے — مچھیرے نے اپنی ناؤ تھوڑی سی آگے بڑھا دی اور خورشی نے دیکھا، اس کی ناؤ میں بہت سی مچھلیاں ہیں۔ اس کی آنکھوں سے ایک عجیب کم مائگی کا احساس جھلکنے لگا۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا یہ آدمی بڑا قابل ماہی گیر نظر آتا ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ آدمی نے جاتے جاتے کہا

"اللہ کی قسم! ڈل جھیل سے بھی زیادہ اچھی ہو —!"

خورشی کو غصہ ہی تو آگیا "جانے کیا سمجھا ہے مجھے ہنہ!" اور

اُس پانی کی سطح سے غائب ہو گیا۔

لیکن یہ تو بہت پرانی بات تھی۔ اُن دنوں وہ اپنی ماں کے ساتھ جھیل پر آیا کرتی تھی۔ اور ان دنوں اس کا بیاہ بھی تو نہیں ہوا تھا جب سے آج تک بہت سی چیزیں بدل گئیں۔ وہ پیپر ابھی بدلا تھا۔ اور چنار ابن گیا تھا اس کا پرانا ساتھی! خورشی کی آنکھوں سے یوں ہی آنسو نکل پڑے اور پانی میں جھیل ہو گئے۔ اس نے جلدی سے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا نہ جانے چنار کی یاد آتے ہی اس کی آنکھیں کیوں بھر آئی تھیں

سورج اب ماتھے پر آ گیا تھا۔ اور ابھی تک نہ وہ بیٹا ایک مچھلی پکڑ سکی تھی۔ اس نے آس پاس کی پہاڑیوں کی طرف دیکھا جو چپ چاپ کھڑی تھیں جیسے وہ بھی مچھلیوں کی تاک میں ہوں۔ تھوڑی دور دو بطخیں کنول کا پھل ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے جھیل کے بیچ میں اونٹ بیٹھا جگالی کر رہا ہو۔

خورشی زندگی بھر لہروں اور مچھلیوں سے آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھی وہ بہت چھوٹی سی تھی۔ ان دنوں جب اُس کا باپ رسُل اسے اپنی ناؤ میں بٹھا کر جھیل کی طرف لے جاتا تھا۔ اُن دنوں وہ ایک گندمی سی لڑکی تھی جس کی ناک ہر دم بہتی رہتی تھی۔ وہ ناؤ کے سرے پر بیٹھے بیٹھے چھوٹی بڑی مچھلیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھی کبھی کسی تڑپتی ہوئی مچھلی کو پانی میں چھوڑ کر دور تک اس کا تیرنا دیکھتی رہتی اور تالیاں بجا بجا کر اپنی توتلی زبان میں کچھ کہتی رہتی تھی۔ رسُل مچھلیاں چھوڑ دینے پر اسے تھپڑ اور لات سے نوازتا۔ اور وہ دیر تک روتی رہتی تھی۔ اور روتے روتے ہی کھیلنے لگ جاتی تھی۔

اور اُس کا باپ ناؤ کے سرے پر کھڑے کھڑے اکڑ جاتا تو وہ اُس کا انتظار کرتے کرتے تھک سا جاتا۔ اور وہ آسمان کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھرتا۔ خدایا کیا آج شام کو میرے گھر چولھا نہ جلے گا۔ لیکن اس کی خوش قسمتی یہ کہاں جانتی تھی۔ کہ چولہا نہ جلنے سے کیا ہوتا ہے مچھلیاں نہ پکنے سے کیا ہوتا ہے بہت چھوٹی سی تھی نا تب تو ـــ

پھر جب وہ کچھ بڑھ گئی تھی۔ تو سارے دن بھر اپنے جھونپڑے میں بیٹھ کر اپنے چھوٹے بھائی کی خبر گیری کیا کرتی تھی۔ وہ جھونپڑے کے دروازے پر بیٹھی بیٹھی اکتا جاتی تھی۔ اپنی ماں کو دل ہی دل میں کوستی رہتی تھی لیکن پھر بھی ننھے منے بھائی ممدو کو اتنا پیار کرتی تھی۔ کہ وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا کرتا تھا ـــ

اور اُس کی ماں دن بھر ٹوکرے میں مچھلیاں رکھے شہر کے گلی کوچوں کے چکر لگاتی رہتی تھی ـــ اور شام ہوتے ہوتے تھکی ہاری نیم جان سی ہو کر چند مٹھی سی مٹھی میں چند سکے دبائے گھر کو لوٹ آتی تھی ـــ اور ننھے ممدو کو روتا دیکھ کر خود بھی رونے بیٹھ جاتی تھی ـــ بس یہی اُن کی ساری زندگی تھی ـــ ساری کائنات تھی۔

اُس کے بعد جب وہ اور بڑی ہو گئی تو ماں کے ساتھ شہر جانے لگی تھی اور گندے اسنگھ کے غلیظ اور بدبودار کوچے سے متعارف ہوئی تھی۔ جہاں وہ میٹھے میٹھے چلاتی رہتی ـــ "ڈل کی مچھلیاں۔ جو وہ آنے سیر۔"

پھر دو چیزیں ایک ساتھ ہوئی تھیں۔ جوانی آئی تھی اور باپ گیا تھا۔ باپ کے مر جانے کے بعد اُس کی ماں جھیل پر مچھلیاں پکڑنے جاتی تھی۔ اور وہ اکیلی گندے اسنگھ کے مکروہ اور بدبودار کوچے میں مچھلیاں بیچنے جاتی تھی ـــ

اسی تاریک کوچے میں وہ پہلی بار مفلسی کے آغاز جوانی سے آگاہ ہوئی تھی۔ یہاں سے نہ جانے کتنے ہی لوگ دن بھر آتے جاتے رہتے تھے۔ اور کتنی ہی نگاہیں اس کے جسم پر سے ہوتے ہوئے فرق سے گذر کر اس کی جوانیوں کو تاکا کرتی تھیں۔ یہیں اس کے دل میں ایک نامعلوم خوف سا بھر گیا تھا۔ اور اس نے اپنے سینے کو چھپا کر رکھنا سیکھا تھا۔ اپنے بازوؤں کو میلی اور گندی اوڑھنی کی تہوں میں چھپانا سیکھا تھا۔ اسی کوچے میں اس کے تصور نے جنم لیا تھا۔ اس تصور نے جو ہر جوان اور مفلس لڑکی کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ کہیں کوئی راہ چلتا لوٹ نہ لے۔ کہیں کوئی بے باک نگاہ دل کے پردوں کو چیر کر اندر نہ گھس آئے۔ کہیں کوئی گستاخ ہاتھ بڑھتا بڑھتا آگے ہی نہ بڑھ جائے۔ کہیں کوئی منچلا بانہہ پکڑ کے بانہہ ہی نہ مروڑ دے۔——

یہیں اس نے میونسپلٹی کے جمعدار کو ایک آنہ رشوت دینا بھی سیکھ لیا تھا۔ اسی کوچے میں اس نے اپنے خوابوں کے تانے بانے بنے تھے۔ کھیلتے بچوں کی کلکاریاں اپنے تصور کے دریچوں میں سنی تھیں۔ پھر ایک دن اسی دریچے سے موت آن پہنچی تھی۔ اور آن کی آن میں اس کی ماں کو دبوچ کر لے گئی تھی۔ —— اور اسے تارزن کی مہارانی بننا پڑا تھا۔ جھیل کی چنچل لہروں میں پناہ ڈھونڈنی پڑی تھی—— لہروں اور مچھلیوں کا شریکِ کھیل دیکھنا اور کھیلنا پڑا تھا——

جھیل پر مچھلیاں پکڑتے پکڑتے اس کے تصور نے چند نئی بلندیوں کو پکڑنا چاہا تھا۔ اس کی خواہشات نے اسے اکسانا شروع کیا

نکالتا۔ کون جانے کبھی کہیں سے ایک نیا فرن مل جائے جس کے گریبان پر زرکاری کا کام کیا ہوا ہو۔ ایک نئی اوڑھنی مل جائے جس میں مصنوعی تارے ٹنکے ہوں ایک کنگھی کہیں سے ہاتھ لگے جس سے وہ لمبے سیاہ بالوں کو روز سنوار سکے۔ اس کے بھائی کے لئے ایک نئی قمیص مل جائے جسے پہن کر وہ شہر کے گلی کوچوں میں مچھلیاں بیچتا پھرے۔ کہیں سے ایک سماوار مل جائے تاکہ وہ بھی دوسرے مچھیروں کی طرح اپنی ناؤ میں بیٹھ کر اپنے لئے نمکین چائے بنا سکے۔

لیکن جیسے ہی بڑا ہوا اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ یہ سب خواہشیں پوری نہیں ہو سکتیں۔ دن بھر آٹھ دس آنے کی مچھلیاں تو کل ہاتھ آتی تھیں اور یہ آٹھ دس آنے صرف پیٹ کی آگ بجھانے کے کام آتے تھے۔ اس احساس کے بعد اُس نے مفلسی کے تلخ جام کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا تھا جس کی تلخی جب سے آج تک برابر اُس کی رگوں میں اور شریانوں میں دوڑتی آئی تھی۔

انہی لہروں کے بیچ ایک دن اس نے جبار کو دیکھا تھا اور اس کی دلہن بن گئی تھی۔ اور اپنے ہاتھوں میں مہندی لگائی تھی۔ اپنے بال سنوارے تھے اور اپنی آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیریں بھر دی تھیں۔ اور اپنے ہونٹ دنداسہ کے چھلکوں سے لال کئے تھے۔ اسی جھیل کی گہرائیوں سے ایک دن اُس نے ننھے کو ابھرتا ہوا دیکھا تھا۔ اور اس کے انگ انگ سے اُس کے استقبال کی تیاریاں پھوٹ پڑی تھیں۔ پر ننھے کو لانا اتنا مشکل

نہیں تھا جتنا اُس کے لیے دودھ کا انتظام کرنا مشکل تھا جتنا اس کے لیے ایک چھوٹی سی کالے کپڑے کی ٹوپی دستیاب کرنا مشکل تھا جتنا اسے پہنانا چھپانا مشکل تھا۔

اور اسی مشکل کا حل تلاش کرنے جیا را بخاری مزدوری کرنے نکلا تھا۔ جیا را نے اُس دن کہا تھا۔ کہ وہ کچھ ہی مہینے بعد روپیہ لے کر لوٹ آئے گا جس طرح اس سال چھوڑ آیا تھا۔ غفار چلا آیا تھا — اور نہ جانے کتنے تھے —

اس کے جانے کے بعد جورشنی کو سب کام کرنے پڑتے تھے چیل پر بھی جاتی۔ شہر کے گلی کوچوں کے چکر بھی لگا آتی۔ کبھی کبھی گنڈا سنگھ کے باغیچے میں بھی وہ ایک گھڑی بیٹھ جاتی۔ اس چڑیا کی طرح جو دن بھر دور دور تک اڑ کر دانہ تلاش کرتی ہے۔ اور شام پڑے اپنے گھونسلے کو لوٹ آتی ہے اور اپنے بچوں کو اپنے تھکے ہارے پروں کے نیچے بٹھا لیتی ہے۔

پر اب کی بار مشکل یہ تھی۔ کہ ننھے کو ساتھ لے جانا پڑتا تھا۔ گھر میں کوئی نہ تھا جس کے پاس چھوڑ آتی۔ ایک ممدو تھا۔ ماں باپ کی آخری نشانی۔ مسعود ایک سال پہلے ایک رات گھر سے بھاگ گیا تھا۔ اور آج تک اُس کا کچھ پتہ نہ چلا تھا کہ کہاں ہے۔ یا ہے بھی کہ نہیں۔ اپنے اِن لاڈلے بھائی کے لیے بہن نے کتنے ہی آنسو رات کی تاریکی میں بہائے تھے لیکن آنسو بہہ لگا کیا۔ بہہ جاتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں بچہ کوئی نہ دیکھنے پائے

والا پتہ نہیں ہوتا۔

اگر وہ سوچتی جانے ہی نہ دیا ہوتا جاکر کو پردیس۔ کون جانے مجھ کا ہی نہ ہوتا ہم وہاں ——

خورشی کی آنکھیں پہاڑیوں کی طرف۔ دیکھتے دیکھتے آنسو بھر آئے اُس نے ہتھیلی سے آنسو پونچھے اور ننھے کی طرف دیکھنے لگی۔ ننھے کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں ایکبار پھر بھر آئیں۔ اس بار اُس نے ان آنسوؤں کو بہنے دیا۔ بہہ ہی جائیں تو اچھا ہے۔ دل بھی کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ ننھے کے چہرے میں وہ اپنی ساری زندگی کی داستان دیکھ رہی تھی۔ جنت۔ یہ جنت۔ اُس کی کی ساری کائنات اس ننھے سے چہرے میں سمٹ آئی تھی۔ اور پھر اس چہرے پر حیدر علی کی شکل کا پرتو بھی تو تھا۔ خورشی کو ایسے میں ہی پرانی بات یاد آگئی۔ ان دنوں حیدر علی اُس کے چہرے پر نظریں جمائے اپنے ہی ساتھ باتیں کیا کرتا تھا جب کہ وہ سوئی ہوئی تھی۔ اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں — اُس نے کئی بار جھوٹ موٹ ہی نیند کا بہانہ کرکے ان باتوں کو سنا تھا۔ ان باتوں کو سن کر وہ کتنا شرما سی جاتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خمار کی کتنی تہیں سی چڑھ جاتی تھیں اور وہ اپنے سارے بدن میں کیسی عجیب سی کپکپاہٹ سی محسوس کرتی تھی

"کسی راجہ کے گھر میں ہوتی تو سکھ سے رہتی۔ اچھے اچھے کپڑے پہنتی، چمکتی رہتی ...... میرے پاس کیا ہے، ایک چھوٹی سی ناؤ ہے۔ ایک نا ارث

ہے اور دو ہاتھ ہیں۔"

ایسے میں کبھی ہوبی جبار اکی کتنی باتیں اسے یاد تھیں وہ اکثر جھیل کے کنارے ان باتوں کو یاد کر کے لوٹ پوٹ ہو جایا کرتی تھی۔ ایسے میں جھیل بھی کبھی دلکش نظر آنے لگی تھی جیسے خوشی میں بہایا ہوا ایک آنسو پھیلتے پھیلتے پھیل ہی گیا ہو۔ لیکن آج ان باتوں کو یاد کر کے اس کی آنکھوں سے آنسو کیوں نکل آتے ہیں — وہ لوٹ پوٹ کیوں نہیں ہو جاتی۔ — آج جھیل بھی کیوں ایسی دکھائی دیتی ہے جیسے کسی نوخیز بیوہ کے گالوں پہ بہے ہوئے آنسو کی لکیر —

اس نے ننھے کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بہت دیر تک ان باتوں کو یاد کیا۔ پر ننھا اپنی نیند ہی میں مسکرا رہا تھا۔ شاید اس کے خیالوں کا منہ چڑھانے کے لئے اس نے دل ہی دل میں کہا خدایا! اس ننھی سی جان کو دنیا میں بھیجدیا تو کسی بڑے گھرانے میں ٹپکا دیا ہوتا۔ ورنہ اس سے بہتر تھا کہ اُسے یہاں بھیجا ہی نہیں۔

لیکن یہ کہہ کر وہ تھر تھر کانپنے لگی "میرے جگر کا ٹکڑا!" اس نے اس کے ماتھے پر ایک انمول اور لازوال بوسہ ثبت کیا — وہ جلدی سے اٹھی اور ناؤ سنبھال کر پھر ناؤ کے سرے پر کھڑی ہو گئی۔ اور نگاہیں جھیل کی گہرائیوں میں ڈبو دیں۔

لمحے بیت گئے۔ اور ناؤ جھیل کی لہروں پر ہوتے ہوئے تھرکتی رہی خودکشی نے کئی بار ناؤ کی لہروں پر ڈنڈے مارا۔ پر کوئی مچھلی نہ تڑپی۔ کھڑے کھڑے اسکی

ٹانگوں میں اینٹھن ہونے لگی۔ اس کے بازو شل ہونے لگے، اُس کی نگاہیں پتھرانے لگیں۔ لیکن وہ کھڑی ہی رہی۔ اُس نے سوچا اگر یوں ہی کھڑے کھڑے میں سر سے پیر تک اکڑ بھی جاؤں، جب بھی ہار کر نہیں بیٹھوں گی، تاکہ بعد میں کوئی یہ نہ کہے کہ بیچاری کے بعد خودکشی سے اپنا آپ سنبھالا نہ گیا ـــــ

اُس نے کھڑے کھڑے ہی پھر جھیل کے چاروں طرف اپنی نگاہیں دوڑائیں۔ چند چھیرے تھک ہار کر اپنی اپنی ناؤ کے سرے پر بیٹھ کر سستانے لگے تھے کچھ بگلوں کی طرح گم سم سے کھڑے ہی تھے۔ کسی ناؤ سے سماوار کی نالی بھاپ چھوڑ رہی تھی۔ خورشی نے فوراً اپنی نگاہیں وہاں سے پھیر لیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ہمسایہ مچھیرن ہمدردی کے جذبہ کے تحت چائے کی ایک پیالی کے لئے اصرار کرے۔ چائے کی طلب تو اُسے بھی ہو رہی تھی۔ لیکن جب اپنا سماوار ہی نہیں تو اس طلب کا گلا گھونٹ دینا ہی اچھا ـــــ کل کلاں ہی عورتیں کہیں گی۔ ہمارے ہی ٹکڑوں پر پل کے اتنے دن گزار دیئے۔

اُس نے چپو سنبھال کر ناؤ کو دھیرے دھیرے کھینا شروع کیا۔ ناؤ جھیل کی لہروں پر شپاشپ کرتی ہوئی، پانیوں کو چیرتی ہوئی دوتہ کدل کی طرف جانے لگی۔ اُس نے سوچا پُل کے نیچے اُسے ضرور کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ آج تو ضرور ہی کچھ ملنا چاہئے۔ کیونکہ آج سویرے سے ننھے کا پیٹ اچھی طرح سے بھرا نہیں تھا۔

"پُل کے نیچے پہنچ کر اُس نے چپو چھوڑ دیا۔ اور ایک بار پھر نارز سنبھالے کھڑی ہوگئی۔ پُل کی محراب پر ایک رام چڑیا اس سے پہلے ہی تاک میں بیٹھی

تھی۔ کہ کب کوئی چھوٹی سی مچھلی سطح کے قریب آئے اور کب وہ ڈبکی لگا کر اُسے پکڑ کر لائے۔ خورشی نے پیار سے اِس رام چڑیا کی طرف دیکھا اُس کے بھی بچے ہوں گے جو ابھی تک اُڑنا نہیں جانتے ہیں اور کون جانے وہ بھی ننھے کی طرح بھوکے ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے رام چڑیا نے ڈبکی لگائی اور دوسرے لمحے اپنی لمبی سی چونچ میں ایک چھوٹی سی مچھلی پکڑے اپنے پر تولنے لگی۔ لیکن مچھلی اُس کی چونچ سے پھسل کر پھر پانی میں آ گری اور لہروں میں غائب ہو گئی۔ اس کے پر جیسے ٹوٹ سے گئے۔

خورشی کا کلیجہ جیسے منہ کو آ گیا۔ اُس نے شدت غم سے اپنا ہونٹ کاٹ دیا۔ پر ساتھ ہی اُس کا نارڑ اُچھلا پانی میں دائرے سے بن گئے۔ ایک اُچھلا کا ہوا ایک ہاتھ لگا۔ اور دوسرے لمحے ایک بڑی سی مچھلی اُس کی ناؤ میں تڑپ رہی تھی۔ خورشی نے بغیر دیکھے ہی محسوس کیا کہ رام چڑیا حسرت سے اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔

سورج ڈوبنے کے قریب آ گیا تھا اور خورشی کا ننھا نیند سے جاگ پڑا۔ اُس نے نارڑ ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور پھٹے ہوئے فرن سے چھاتی نکال کر ننھے کو دودھ پلانے لگی۔ دودھ پلاتے پلاتے اسے یہ احساس اب بھی کھٹے جا رہا تھا کہ چھاتیوں سے بہت کم دودھ نکلتا ہے یہ احساس ننھے کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا۔ جو دودھ نچوڑتے نچوڑتے ماں کے چہرے کو تک رہی تھیں۔

جیسے کہہ رہی ہوں: ہاں! آج اِن شکموں میں دودھ کیوں نہیں؟ کیا ہوا جس سے

یہ بھرتے سوکھ گئے — یہ تو صرف میرا حق تھا کس نے چھین لیا۔

دودھ پلاتے پلاتے خورشی کو سارا بدن تھکن سے چور چور ہوتا ہوا محسوس

ہوا اُس کا انگ انگ دُکھنے لگا — اور اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ —

آج صبح سے اُس نے تین مچھلیاں پکڑی تھیں! اور وہ قدرے خوش تھی کیونکہ

پچھلے دو دن خالی گئے تھے اُس نے سوچا مچھلیاں تقریباً کوئی ڈیڑھ سیر کے قریب

ہیں اور وہ چاہنے لگی کاش یہیں کوئی خریدار مل جائے تاکہ وہ ان کے اچھے

داموں انہیں بیچ کر تھوڑا سا دودھ لے آئے اور اپنے لئے کچھ چاول بھی

— ورنہ دوسرے دن تک انتظار کرنا پڑتا اور پھر شہر جانا پڑتا — گلی کوچوں

میں ماری ماری پھرنا پڑتا۔ دیر تک وہ یونہی آنکھیں بند کئے تھکے کو دودھ

پلاتی رہی —

" او مچھلی والی! مچھلیاں ہیں؟" کسی نے آواز دی۔ وہ چونک اٹھی اور

آنکھیں کھولدیں۔ سامنے سے ایک شکارا شاید نشاط باغ سے آ رہا تھا۔

شکارے ہی میں بیٹھا ہوا کوئی آدمی پوچھ رہا تھا —

"ہاں ہیں —" اُس نے جلدی سے کہا اور بچے کو دھیرے سے

ناؤ میں رکھ کر چپو سنبھال ناؤ کھینے لگی۔ اُس کے انگ انگ کی تکان کافور

ہوگئی۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر بجا لائی کہ خریدار یہیں مل گیا۔

"کیسی ہیں؟ بڑی کہ چھوٹی؟" اُس آدمی کا شکارا اب ناؤ کے پاس آگیا تھا۔

"بڑی ہیں۔ کوئی ڈیڑھ سیر کے قریب ہیں ساری کی ساری۔" خورشی

نے چٹائی کے نیچے سے تینوں مچھلیاں باہر نکال کر دکھائیں۔

"کتنے پیسے دوگی ۔۔؟" آدمی نے مچھلیوں کو ایک نظر دیکھتے ہوئے کہا

"شام کا وقت ہے اس لئے ایک ہی روپیہ دے دو" خورشی نے

سوچا ایک ہی جائیں تو اچھا ہے

"ارے ایک روپیہ؟ تین ہی تو مچھلیاں ہیں ۔۔" آدمی نے قدرے

اندر سے کہا حالانکہ وہ یہ بخوبی جانتا تھا کہ بازار میں کسی حالت میں بھی یہ ڈیڑھ

روپیہ سے کم میں نہ ملیں گی۔

ارمی کیا کہتی ہو تم؟ ایک روپیہ اور تین مچھلیوں کا۔ توبہ! " شکارے کے ہانجی

نے بھی کہا۔ شاید اپنی سواری کو خوش کرنے کے لئے۔ خورشی کو غصہ آگیا۔ لیکن غریب

کا غصہ ہی کیا غریب تو خود دنیا بھر کے غصہ کا شکار ہوتا ہے۔

"تمہارے بیچ میں بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" اس نے ہانجی کی طرف

قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آٹھ آنے دوں گا۔ منظور ہو تو دے جاؤ۔" آدمی کہہ رہا تھا

خورشی کے لبوں تک کوئی تلخ لفظ آتے آتے رک گیا۔ اس نے سوچا کہ آٹھ

آنے تو کچھ بھی نہیں اسے دن بھر کی اینٹھن اور تھکن یاد آئی۔ اپنی ساری محنت

سامنے کھڑی نظر آئی۔ انکار کر دوں اس نے فیصلہ کیا لیکن ساتھ ہی خیال آیا

کہ انکار کے معنی ہیں اسے آج شام کو بھی بھوکے پیٹ سونا پڑے گا۔ اور ننھے

کا دودھ بھی نہیں آئے گا۔ اس نے زبان سے کچھ کہا نہیں بلکہ دھیرے سے

یہ تین مچھلیاں، دن بھر کی محنت اٹھا کر شکارے میں رکھ دیں۔

آدمی نے اپنی جیب، ٹٹولی اور آہستہ سے ایک اٹھنی نکال کر خورشی کی طرف بڑھا دی۔ جیسے یہ اٹھنی دینا بھی اُسے پسند نہ آتا ہو ـــ پردہ ہی کیا کسی کو بھی غریب، کی محنت کا معاوضہ دینا پسند نہیں آتا۔

شکارے کو ہلکی سی حرکت ہوئی۔ آدمی کا ہاتھ قدرے پیچھے سرک گیا ـــ اور اٹھنی خورشی کے منتظر ہاتھوں میں پہنچنے سے پہلے ہی پانی میں گر گئی پانی کی سطح پر ایک چھوٹا سا دائرہ بن گیا، ایک ہلکی سی ہلچل مچ گئی۔ اور اٹھنی دھیرے دھیرے ندی کی جانب اترنے لگی۔ شکارے کے مالک کی آنکھوں میں صرف ایک لمحہ کے لئے فتحمندی کی شعاع چمک گئی ـــ اور فوراً ڈوب گئی ـــ

خورشی کو وہ رام چڑیا یاد آئی جس کی چونچ سے مچھلی پھسل کر لہروں میں چھپ سے غائب ہو گئی تھی۔ اُسے اپنی آنکھوں میں آنسو امڈتے ہوئے محسوس ہوئے ـــ لیکن اُس نے انہیں روک دیا ـــ

"پیسے تو آپ کے ہاتھ سے گر گئے ـــ!" اُس نے تن کر کہا۔

"ارے واہ! خود ہی تو گرا دی اٹھنی ـــ تم لوگ ہوتے ہی ذلیل ہو جھوٹ تمہاری زبان کی نوک پر ہے ـــ!

آدمی غرّایا

"ہاں ہاں! غلطی تمہاری ہے" ان کا کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے اٹھنی اچھی طرح تھما دی تھی ـــ"

ہانجی نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی ـــ

خورشی کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے نارژ اُس کے سینے میں گھونپ دیا ہو۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر اس نے بے خبری میں اپنا نارژ اٹھایا اور آدمی کے سر کو نشانہ بنا کر اُچھالا ——

—— تم لوگ ہمیشہ سے ہی ذلیل ہو ——،

پھر ایک تیز چیخ بلند ہوئی۔ ایک ناگاہ فضا میں اُچھلی ایک دھچکا لگا ——
اور خورشی کو دکھائی دیا کہ نارژ آدمی کے سر میں گھس گیا ——

تم لوگ ہو —— تم ہی ذلیل ہو ——،

اسے کہیں دور سے چپو کی شپ شپ سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا شکارا کچھ دور لہروں کو چیرتا ہوا جا رہا تھا۔ شکارے میں آدمی بیٹھا ایک سگریٹ پی رہا تھا۔ اور مانجی کوئی کشمیری گیت گاتا ہوا چپو چلا رہا تھا۔۔۔ شکارے میں خورشی کی وہ تین مچھلیاں بھی پڑی تھیں۔

کچھ بھی نہیں ہوا تھا نہ نارژ اچھالا تھا نہ چیخ بلند ہوئی تھی، نہ کسی کا سر دُھڑ میں مٹ گیا تھا —— صرف خورشی کے زخمی دل میں ایک اور زخم کا اضافہ ہوا تھا۔ اس نے دور تک شکارے کو جاتے ہوئے دیکھا دھندلی آنکھوں سے —— اور دل ہی دل میں کہا —— "بابو! قصور تمہارا بھی نہیں! صرف اس کا ہے جو منہ تک لایا ہوا نوالہ چھین کر ہی خوش ہوتا ہے۔ ننھے بچوں کی طرح تالیاں بجاتا تھا ——"

پھر اس نے ڈھیر سے ننھے کو اٹھایا اور اپنے پھٹے ہوئے فرن سے چھاتی نکال کر اس کے منہ سے لگا دی اور چپو سنبھال کر اپنی ناؤ کو گھر کی جانب کھینے لگی۔ دل میں دور دور تک شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے

تحریر تحصیل کی داستان

(ابتدائیہ نوٹ)

حضرات!

آج سے تین برس پہلے میں نے یہ داستان قلم بند کی تو اپنے ایک دوست کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسے ایک عالم و فاضل کو دکھایا تاکہ وہ اس داستان کا لب و لہجہ وغیرہ درست فرمائیں۔ عالم و فاضل نے اس ناچیز کو مشورہ دیا کہ داستان میں کوئی جمالیات نہیں۔ اس لئے اسے دوبارہ قلم بند کیا جائے چنانچہ میں نے اسے دوبارہ قلم بند کر کے موصوف کو دکھایا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اس میں سماجی و اقتصادی پس منظر کا فقدان ہے۔ میں نے تیسری بار اسے لکھ کر پیش کیا۔ تو انہوں نے فرمایا۔ کہ اس میں ثقافتی رنگ نہیں علاوہ اس طرح آج تک یہ داستان چالیس بار لکھ چکا ہوں۔ اب میں اسے آخری

بار پھر قلمبند کر رہا تھا۔ جس میں سے ابھی میں عالم و فاضل موصوف کے فرمانے کے مطابق سب پہلو مد نظر رکھ کر ترمیم کر سکتا ہوں۔ لیکن اب بار اپنے موصوف کو دکھانا پھر نہیں۔ حضرات کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کیونکہ اگر میں ان سے الگ کے پاس لے جاؤں۔ تو ممکن ہے وہ پھر مجھے مشورہ دیں کہ میں اسے ایک بار اور قلم بند کروں۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ داستان کبھی آپ حضرات کی خدمت میں پیش نہ ہو سکے گی۔ امید واثق ہے کہ آپ اس کی خامیوں اور کمیوں کو جو عالم و فاضل موصوف کو نہ دکھا سکنے کی وجہ سے اس میں رہ گئی ہوں نظر انداز فرمائیں گے۔ فقط بھجو رام تنتر تحصیل

(سماجی پس منظر)

حضرات!

میں بھجو رام ولد گوبند رام علاقہ سودیش پور کا رہنے والا ہوں۔ سودیش پور ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جہاں کے لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے ہیں اور مویشی پالتے ہیں۔ یہاں ایک دکاندار ہے، ایک پنساری اور ایک لوہار ہے۔ ایک درزی اور کمہار ہے۔ علاقہ سودیش پور کے لوگ تقریباً سب کے سب ان پڑھ ہیں۔ صرف ہمارا ایک گھرانہ ہے جس میں تعلیم کا شغل آتا ہے چنانچہ چار پشتوں سے ہمارے گھرانے کے افراد کلرکی کا پیشہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ ناچیز سودیش پور کا واحد آدمی ہے جس نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کی ہے۔ [illegible] سودیش پور کے سب مکانات تقریباً کچے [illegible]

ہیں یہی وجہ ہے کہ علاقہ سودیشی پور میں سال میں دو چار مرتبہ آگ لگ جاتی ہے سارے علاقہ میں ہمارا مکان مشہور ہے کیوں کہ یہ واحد مکان ہے جو پکی اینٹوں کا بنا ہوا ہے ہمارے علاقہ سودیشی پور میں ایک پختہ کنواں ہے جو سورگباشی ناتھ دین دیال نے اپنے پہلے لڑکے کے پہلے جنم دن پر بنوایا تھا۔ اس کنویں پر سودیش پور کی لڑکیاں اور عورتیں پانی بھرنے آتی ہیں لیکن پیار اور محبت کی کوئی داستان جنم نہیں لیتی جیسا کہ عام طور پر دوسری جگہوں میں ہوتا ہے (میں ناچیز نے بہت سی کتابوں میں ایسی داستانیں پڑھی ہیں)

(اقتصادی پس منظر)

میرے انٹرینس پاس کرتے ہی میرے والد سورگ کی طرف سدھار گئے۔ وہ علاقے کی تحصیل میں چالیس روپے ماہوار پر مقرر تھے ان کے سورگباش ہونے پر جناب تحصیل دار صاحب بہادر نے کمال نوازش سے مجھے ان کی جگہ دے دی لیکن چونکہ میں ناتجربہ کار اور خام تھا۔ اس لئے تنخواہ صرف بائیس روپے مقرر کی گئی۔ اب یہ تنخواہ بڑھ کر پچاس روپے ہو گئی ہے بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ نوکری کرتے ہوئے ابھی مجھے چھ ہی مہینے ہوئے تھے کہ میری شادی پاس کے گاؤں کے نمبردار چیچی رام جی کی سپتری ستیا دیوی سے ہو گئی۔ اب ہماری شادی کو سترہ برس ہو گئے ہیں۔ اور میں چار لڑکوں کا باپ اور میری دھرم پتنی تین لڑکیوں کی ماں بن گئی ہے۔ کل ملا کے ہمارے سات بچے ہو چکے ہیں۔ بھگوان کی مہربانی ہمیشہ شامل حال رہی ہے۔ نوکری کے آٹھویں برس ہی تحصیل ہذا میں تبدیلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کی بنا پر

مجھے شہر کی تحصیل میں بھیج دیا گیا۔ اور آج نو برس سے میں اسی جگہ تعینات ہوں
چونکہ اپنے مویشی، پوری چیزیں سستی ملتی تھیں اور مکان کا کرایہ بھی نہیں دینا
پڑتا تھا۔ اور باپ کے زمانے کی ایک گائے بھی تھی۔ اور سبزی ترکاری پیدا
کرنے کے لیے مکان کے پیچھے زمین کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ اس سے تنگدستی
کا سامنا کبھی نہ ہوا تھا لیکن شہر میں آکر تنگی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ مہینے
کے آخری دنوں میں قریب قریب فاقوں تک نوبت آئی۔ مگر ناچیز اس
خاندان کا چشم و چراغ ہے جہاں بچپن ہی سے قناعت کا سبق پڑھایا
جاتا تھا۔ اس لیے میں نے بچپن سے سیکھے ہوئے اسی سبق پر عمل کیا اور
ہماری حالت بہتر ہو گئی۔ اب بھگوان کی دیا سے دونوں وقت کھانا ملتا ہے
اور فاقوں کی نوبت نہیں آتی۔ رہی دودھ اور لسی کی بات تو ان چیزوں
کی عادت ہم نے ترک کر دی ہے۔ اس لیے کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں
ہوتی۔ الغرض بھگوان کی دیا ہر وقت شامل حال رہی ہے۔

(سیاسی پس منظر)

ایک سرکاری ملازم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ سیاست کے ساتھ
بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی تعلق نہ رکھے۔ اس لیے میں عالم و فاضل موصوف کے
کہنے کے باوجود اس داستان کا سیاسی پس منظر لکھنے سے قاصر ہوں اور اس کے
لیے معذرت چاہتا ہوں۔

(داستان کی وجہ تسمیہ)

حضرات !!

اس داستان کو قلم بند کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جب سے اس داستان کا جنم ہوا میرے دل میں ایک طرح کی گھٹن پیدا ہو گئی۔ دن کو تحصیل کے کاموں میں الجھا رہتا تھا اس لئے خیال اس طرف کم جاتا تھا۔ لیکن رات کو یہ گھٹن شدت اختیار کر لیتی تھی۔ کئی ہفتے اسی مرض میں مبتلا رہا۔ دھرم پتنی سے کہا لیکن اس نے بھی اس طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ آخر ایک بار رات جب اُس گھٹن نے شدت اختیار کی۔ اور نیند بالکل اڑ گئی تو میں اُٹھا کہ یہ داستان قلمبند کرنے لگا۔ اور قلمبند کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے سینے پر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہے۔

نوٹ

اگر یہ داستان پڑھنے کے بعد آپ بھی اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کریں تو یہ ناچیز آپ کو مشورہ دیتا ہے کہ آپ بھی اپنی داستان قلمبند کیجئے بوجھ بشرطیکہ اتر جائے گا۔

(لبھو رام)

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ نوکری کے آٹھویں برس میں میرا تبادلہ شہر کی تحصیل میں کر دیا گیا۔ ہم نے شہر کے ایک محلے میں سات روپے ماہوار پر مکان کا بندوبست کیا۔ شہر میں مکانوں کی قلت دیکھ کر ہم نے اُسے غنیمت سمجھا اور اُس میں رہنے لگے۔ مکان بہت خستہ تھا۔ اور اس کی چھت جھکی تھی۔ اور اُس میں دھوپ کا تو کیا ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہوتا تھا۔ لیکن ہم نے اس طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ہمارے ہمسایہ میں ایک اور محرر رہتا تھا جو محکمہ آبپاشی

میں ملازم تھا۔ اس کی ایک دھرم پتنی تھی۔ اور وہ تین لڑکوں اور تین لڑکیوں کے والدین بن چکے تھے (اب تو ایک اور لڑکی کا اضافہ اپنے کنبے میں کر چکے ہیں) جیسی کہ عورتوں کی عادت ہے۔ میری دھرم پتنی اور محکمہ آبپاشی کے چپراسی کی دھرم پتنی بہت جلد ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گئیں اور دونوں میں گہرا تعلق ہو گیا۔ ان کی دیا سے راضی خوشی رہتے ہیں لیکن اس کے بعد جیسا کہ عورتوں کا دستور ہے میری دھرم پتنی اور محکمہ آبپاشی کے چپراسی کی دھرم پتنی کی آپس میں چپقلش ہو گئی۔ اور نوبت جھگڑے تک آ پہنچی۔ اس دن جب میں تحصیل سے گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری دھرم پتنی کونے میں منہ پھلائے بیٹھی ہے۔ میں نے پوچھا

"کیا ہو گیا؟ منہ پھلائے کیوں بیٹھی ہو؟"

وہ بھڑک اٹھی۔

"پوچھتے ہو کیا ہو گیا؟ جو نہ ہو جائے تھوڑا ہے!"

"آخر بات کیا ہے؟ کچھ میں بھی تو سنوں!"

میں نے حیران ہو کر پوچھا تو کہنے لگی۔

"تم اب سن کر کیا کرو گے۔ تم نے تو اسی دن حاتم کی قبر پر لات ماری تھی جب مجھے لا کر اس مکان میں ڈال دیا تھا۔ میں پہلے دن ہی بھانپ گئی تھی۔ کہ یہ عورت تیز ہے۔ تم یہاں ہوتے تو دیکھتے۔ کہ کس طرح بڑھ بڑھ کے بولتی ہے۔ جیسے کسی بیرسٹر کی ہی بیوی تو ہے۔ آخر سمجھتی کیا ہے؟ یہاں کوئی اس کا دبیل بیٹھا ہے۔ بڑی ہے تو اپنے گھر میں۔ میں بھی اپنے گھر کی رانی ہوں"

"لیکن بھلی مانس! تم دونوں کی تو آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ اب کیا ہو گیا؟"

میں نے ہنستے اور حیران ہو کر پوچھا۔

"اُن کے بہتے سوتن کا ہو گیا ہے۔ کیوں ہوتا کچھ؟ میرے ساتھ بات چیت بند کرے گی۔ تو جان کس کی جوتی کو پرواہ ہے۔"

یہ کہہ کر میری دھرم پتنی رونے لگی۔ اور روتے روتے میری تسلیا۔ خود ہی کہنے لگی۔ میں نے اپنے طور سے معاملے کی جانچ کی تو پتہ لگا کہ ہمارے ہمسایہ کے ہاں کوئی مہمان آیا تھا جس کے واسطے چائے بنانے کے لیے محکمہ آبپاشی کے محرر کی دھرم پتنی میری دھرم پتنی سے تھوڑی سی چینی مانگنے آئی تھی۔ اور میری دھرم پتنی نے دینے سے انکار کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ ہمارے یہاں بھی ختم ہو گئی ہے۔ تو اُس نے ازراہ تمسخر کہا تھا کہ تم لوگ بھی ہماری طرح کنگلے نکلے۔ بس پھر کیا تھا پہلے تھوڑی سی چخ چخ ہوئی۔ اس کے بعد جھگڑا ہو گیا۔ اور اُس کے بعد قطع تعلق! بات معمولی تھی لیکن سنگین بن گئی۔ ان دونوں عورتوں نے تب سے کبھی ایک دوسری سے بات نہ کی۔ لیکن اپنی اپنی جگہ پر دونوں ایک دوسرے کو طعنے دیتی رہیں، کوستی رہیں۔ اور ایک دوسرے کی ذات میں کیڑے نکالنے لگیں۔ خیر! چونکہ عورتوں کا سبھاؤ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے اور محکمہ آبپاشی کے محرر نے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ کوئی دو سال اسی حالت میں گزر گئے۔

ایک دن حسب معمول جب میں تحصیل کے کام سے فارغ ہو کر گھر آیا تو میری دھرم پتنی خلافِ معمول میری چلم بھرنے لگی۔ چلم بھرتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

"یہ رادھا کا پتی کتنی تنخواہ پاتا ہے ؟"

"میری ہی جتنی پاتا ہوگا۔"

میں نے جواب دیا

"تم نے کچھ سُنا، اُس نے ریڈیو خرید لیا ہے۔ رادھا آج دن بھر بجاتی رہی!"

"ہاں تو خرید لیا ہوگا۔ اِس میں کیا ہے ؟"

"ہم بھی ایک خریدیں گے !"

"لیکن پیسے کہاں سے آئیں گے ؟" میں نے جواب دیا

"وہ کہاں سے لائے ؟" برجستہ جواب ملا

"میں کیا جانوں، لائے ہوں گے کہیں سے !"

میرا اتنا ہی کہنا تھا کہ وہ بھڑک اٹھی

"تم تو جنم کے نکمے ہو۔ نوکری کرتے کرتے اتنے سال ہو گئے لیکن ایک ریڈیو تک نہ خرید سکے۔ کبھی مجھے ایک بالی تک لا کر نہ دی۔ بچے الگ پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہیں۔ آخر تم نوکری کرتے ہو یا گھاس کاٹتے ہو۔؟"

یہ کہہ کر میری دھرم پتنی رونے لگی۔ اپنے گاؤں میں کبھی ایسی نوبت نہ آئی تھی۔ اس لیے میں بہت پریشان ہوا۔ حقہ گڑگڑاتے ہوئے میں سوچنے لگا میری دھرم پتنی جو کچھ کہہ رہی ہے وہ ٹھیک ہے میں نے غور سے اپنی حالت کا جائزہ پھر پرکھا۔ بچوں کے پھٹے ہوئے کپڑے دیکھے۔ دھرم پتنی کی حالت زار دیکھی۔ اندرا اپنے سترہ سالہ پرانے کوٹ کی تہیں ٹٹولیں۔ اپنی تنخواہ کا حساب لگا کر دیکھا جس میں سے ہفتہ بھر کے راشن، سبزی ترکاری، تیل وغیرہ پر خرچ کرکے

کل ڈیڑھ روپے بچتے تھے۔ ذہن میں یہ بھی عورت تھا دو ہی روپے بچتے تھے۔ کیونکہ سات روپے مکان کا کرایہ دینا پڑتا تھا۔ اور باقی دو روپے میں مٹی کا تیل، بھنگی کی تنخواہ جیا کو اور کیسی ہی کتنی چیزیں آتی تھیں۔ آتی کیا تھیں بھگوان کی مہربانی شامل حال تھی۔

اُس روز سے ہمارے گھر میں روز نئے جھگڑوں نے جنم لینا شروع کیا کبھی دھرم پتنی کہتی کہ آٹا ختم ہو گیا ہے۔ چار چھ آنے کی دال چاہئے۔ میں جب معمول خالی جیب دکھاتا تو وہ کہتی۔ روز دھاندلی ماری لائی ہے۔ تو کچھ کیسے کرتے آئے ہیں۔ اور تم چار آنے کی دال کو ترساتے ہو۔ کبھی کہتی گڑیا (یعنی ہماری بڑی لڑکی) کا دوپٹہ تار تار ہو گیا ہے۔ کیا اپنی سوندری جیا تا کو کبھی ہم نے ہی کیوں دیا تھا؟ رفتہ رفتہ ایسی باتوں نے مجھے نڈھال کر دیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ ضرور مجھ میں کوئی خرابی ہے جو محکمہ آبپاشی کے اس محرر میں نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس معاملہ کی جانچ پڑتال کر کے ہی دم لوں گا۔ جب میں نے اس معاملہ کی جانچ کی تو پتہ چلا کہ میرا ہمسایہ یعنی محکمہ آبپاشی کا محرر بڑا خطرناک آدمی ہے۔ رشوت لیتا ہے جس سے ساری چیزیں آتی ہیں۔ توبہ! ہرے رام!

میں نے دھرم پتنی سے اس کا ذکر کیا تو بجائے اس کے کہ وہ میری طرح ہرے رام کہتی۔ اس نے مجھے جھڑک دیا۔ عورت ذات ہی ناقص العقل ہے۔ کہنے لگی۔

" رشوت لیتا ہے تو کون سی برائی کرتا ہے۔ تم سے تو اتنا بھی نہیں ہو سکتا"

جیسا میں نے اپنی مجبوری ظاہر کی اور دھارمک پستکوں کا حوالہ دیا جن

میں رشوت لینا مہا پاپ قرار دیا گیا ہے۔ تیری دھرم پتنی نے مجھے اور بچی بچوں کا اور یہاں تک دھمکی دی کہ اگر میں رشوت لینا شروع نہ کروں گا۔ تو وہ ساری اولاد بچے میرے حوالے کر کے دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی دکھ بھری زندگی کا خاتمہ کرے گی۔ بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ آخر کار مجھے ہار ماننا پڑی۔ بلکہ وعدہ کرنا پڑا۔ کہ میں بھی باقاعدہ رشوت لینا شروع کر دوں گا۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ میں کل سے مندر میں دیپ جلانا بھی شروع کر دوں گا۔ تاکہ رشوت لینے کے گناہ کیا دھو سکا تو ہوتا ہے۔

دوسرے دن جب میں تحصیل میں داخل ہوا۔ تو میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ آج ضرور کچھ نہ کچھ حاصل کر کے رہوں گا۔ بھگوان کا کرنا کیا ہوا۔ کہ ایک آدمی کسی سابقہ فیصلے کی نقل لینے میرے پاس آگیا۔

"آپ کو نقل نہیں مل سکتی!"

میں نے اس کی درخواست پڑھ کر کہا۔

"کیوں نہیں مل سکتی۔؟" اس نے پوچھا۔

"اس لئے کہ میں آج مصروف ہوں۔ چند ضروری مثلیں تیار کرنی ہیں۔"

"مگر مجھے تو نقل آج ہی چاہئے۔ ورنہ معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔"

"میں مجبور ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ کیونکہ رشوت لینے والے ہمیشہ ایسا ہی جواب دیتے ہیں۔

"مہربانی کرو۔ میرا بہت نقصان ہو جائے گا۔"

آدمی نے منت کی اور میں نے موقع غنیمت جانا اور کہا۔

"صرف ایک صورت میں ہو سکتا ہے !"

"کوئی صورت نکالیے۔ میں شکر گذار ہوں گا۔"

"آپ کو نقل لینے کے طور پر پانچ روپے دینے ہوں گے۔"

یہ سن کر وہ آدمی دو ایک منٹ میری طرف دیکھتا رہا۔ شاید میں اُسے ایک آئینہ مشق رشوت خور نظر نہیں آ رہا تھا۔

"آپ نقل تیار کیجئے۔ میں روپے ابھی لاتا ہوں۔" اُس نے کہا اور میری حالت میں جان آئی تھوڑی دیر کے بعد جب وہ آیا تو میں نے نقل تیار کر رکھی تھی۔ صرف تحصیلدار صاحب کے دستخط کرانے باقی تھے۔ اُس نے آکر پانچ روپے کا نوٹ میری جیب میں ڈال دیا۔ میں نے نوٹ نکال کر اندرونی جیب میں رکھا اور کاغذات لے کر تحصیلدار صاحب کے پاس چلا گیا۔ تحصیلدار صاحب نے نقل پڑھ کر اُس پر دستخط کر دیئے۔

میں نقل اُٹھا کر جانے ہی والا تھا کہ انہوں نے پوچھا

"لچھو رام! تم نقل تیار کرنے کے لئے اسامی سے کتنے پیسے لیتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں جناب! یہ تو میرا کام ہی ہے۔"

میں نے جواب دیا۔

"تمہاری جیب میں کتنے پیسے ہیں؟"

انہوں نے دوسرا سوال کیا

"پانچ روپے جناب۔" میں نے جواب دیا

"کہاں ہیں وہ پانچ روپے؟"

انہوں نے تیسرا سوال کیا۔

اور جواب میں میں نے اندر کی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کے دکھایا۔ انہوں نے نوٹ کو دیکھا اور پھر مجھے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

میں نے دیکھا اور کانپنے لگا۔ نوٹ کے ایک کونے پر تحصیلدار صاحب کے دستخط تھے میری ٹانگیں جواب دینے لگیں تحصیلدار صاحب نے اسی وقت اپنے ہیڈ کلرک کو بلا کر میری معطلی کا حکم لکھ دیا۔

جب میں نوکری سے معطل ہو کر گھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں میری دھرم پتنی ہنسی کا مجسمہ بنی بیٹھی ہے۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ لیکن میں خاموش رہا۔

"سنا کچھ تم نے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"رادھا کے پتی کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ آج مکان کی تلاشی بھی ہو رہی تھی"

میں پھر بھی چپ رہا۔

"سنا ہے سرکاری پیسے کا غبن کیا ہے"

میں نے اس پر بھی کچھ نہ کہا۔

"تم بولتے کیوں نہیں؟"

میری دھرم پتنی نے حیرت سے پوچھا۔

"آج تیرے پتی کو بھی معطل کر دیا گیا ہے!" میں نے کھِل کھلا کر کہا۔

"ہائے! تمام ہمارے دشمنوں کو کیوں معطل کیا گیا؟"

"رشوت لینے کے جرم میں!"

اس نے جواب دیا

"میری قسمت تو پہلے ہی پھوٹ رہی۔" پھر اُس کا چہرہ لال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی آنکھیں بھر آئیں پھر آنسوؤں کی دھاریں پھوٹ پڑیں

"میری قسمت اُسی دن پھوٹ گئی تھی جب تم سے بیاہی گئی تھی۔ تم تو جنم کے نکمے ہو۔ تم سے تو رشوت لینا بھی نہیں آتا"

(اشفتا میترا وشٹ)

حضرات!

معطل کے ایک ماہ بعد مجھے تحصیلدار صاحب نے بحال کر دیا۔ جس دن میری بحالی کا حکم ہوا، اس دن ہیڈ کلرک نے مجھے اپنے پاس بلایا

"بھوشن رام اب تم بحال کئے جاتے ہو۔ کیا میں امید کروں کہ تم آئندہ کبھی ایسی غلطی نہیں کرو گے؟"

"جناب میں کان پکڑتا ہوں۔ زندگی میں پہلی بار غلطی سرزد ہوئی تھی آئندہ کبھی نہ ہوگی"

میں نے جواب دیا

"دیکھو بھوشن رام، ہم بھی غلطیاں کرتے ہیں۔ لیکن تمہاری طرح پکڑے نہیں جاتے"

اُس نے چُپکے سے کہا۔

"وہ تو میری بدقسمتی تھی جناب!"

"بدقسمتی نہیں تھی، تمہاری ناواقفیت تھی۔ تم اکیلے اکیلے ہی سارا مال ہڑپ کر جانا چاہتے تھے"

اُس نے کہا۔

میری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔

پھر ہیڈ کلرک نے میرے کان میں کچھ رموز پھونکے اور میری آنکھوں کی پتلیاں اور پھیل گئیں

(معاف کیجئے میں وہ رموز یہاں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔)

اس کے بعد میری تمام شکایتیں رفع ہو گئیں۔ آج کل جناب تحصیلدار صاحب بہادر مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ کاغذات پر بغیر کچھ پوچھے دستخط کر دیتے ہیں۔ دو چار روپے روز کا حصہ تو مل ہی جاتا ہے۔ الغرض بھگوان کی دیا شاملِ حال ہے!

بقلم خود۔ لیکھو رام محررِ تحصیل

افسردہ گلاب

اچھا! تم جا کے سو جاؤ۔

رات بہت ہو گئی ہے۔ تم ہرے ہرے چیل کے تنے سے ٹیک لگائے سایوں میں دھوئیں سا بن کر بیٹھی میری ہر حرکت کا چوری چھپے جائزہ لے رہی ہو۔ میں نہیں جانتا تمہارے ذہن میں اس وقت کون سے خیالات کے سائے تیر رہے ہیں اور تم نہیں جانتیں کہ میں موم بتی کے آنسوؤں کی روشنی میں کیا لکھ رہا ہوں! تم یہ ضرور جانتی ہو کہ میں دن بھر تمہارے بھیا کے ساتھ شطرنج کھیلتے کھیلتے بہت تھکا گیا ہوں۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ پہلگام کی خنک ہوائیں جسم کے اندر گھس آتی ہیں اور آدمی کے بیمار ہونے کا اندیشہ رہتا ہے اس لئے تم جا کے سو جاؤ۔

ادھر خیمے کے اندر سو گیا ہے۔ اور میں آج کی رات ستاروں کی باتیں

مدھم روشنی میں جلتی ہوئی موم بتی کے سامنے گزار دینا چاہتا ہوں۔

جاؤ! کل صبح تک اس کہانی کا جلتا ہوا حصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اور کل شام تک میں بھی اپنے ذہن اور دل کا بوجھ ہلکا کر چکا ہوں گا۔ کل میں تم سے بہت دور جا چکا ہوں گا۔ اور تم حسب معمول کسی خوابوں کی شہزادی کی طرح ایک خوبصورت پونی پر بیٹھ کر اپنے حسین بال لہراتی چندن واڑی تک گھوم آنا۔ پھر روز کی طرح کئی ڈالیں پامال ہوں گے۔ کئی آہیں تمہارا راستہ کاٹیں گی۔ کئی نازک فقرے تمہارے کانوں سے ٹکرائیں گے۔ کئی ذہنوں میں جنت کا تصور آ جائے گا لیکن تمہارے اپنے ذہن کی جنت ویران ویران ہوگی۔

میں کسی ویران جنت کی حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں! تمہاری یہ دو آنکھیں آنسوؤں سے لبریز۔ نہ معلوم جذبوں سے جلتی ہوئی یہ دو آنکھیں۔ مجھے برابر گھورے جا رہی ہیں۔ اور میں اپنے اندر بے چینی سی محسوس کر رہا ہوں۔

اس وقت یادیں تازہ ہیں۔ زخم ہرے ہیں۔ کل تک یہ تازگی ماند پڑ جائے گی۔ کل تک ایک کہانی لکھی جا چکی ہوگی، کہی جا چکی ہوگی، سُنی جا چکی ہوگی۔ دنیا کا ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے۔

اس لئے میری طرف یوں گھور گھور کے دیکھنا چھوڑ دو اور اپنے خیمے میں جا کر سو جاؤ —— سو جاؤ!! —— سو جاؤ!!! ——————

پھلوں کے بوجھ سے جھکی جھکی، انگ انگ سے رس ٹپکاتی۔ رَدم رَدم میں بسی خوشبو میں جھومتی، البیلی، لچکیلی ناشپاتی کی ڈال۔ یہ انیتا ہے۔

ایک ہفتہ پہلے اُس اسی طرح اپنے خیمے کے باہر تاروں کی چھاؤں میں رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دینے کا ارمان لیے بیٹھا تھا۔ لیکن اُس دن میرے سامنے کوئی موہوم تمنا نہ تھی۔ صرف میرے دل میں محبت کا ایک شعلہ موجزن تھا۔ میرے انگ انگ میں پیار کا نشہ رقصاں تھا۔ اور پاس کے خیمے میں آہستہ آہستہ کوئی گا رہا تھا۔ اور ایک چلبلا نغمہ ہواؤں پر اُڑتا ہوا جیا نے کن جذبوں کی چغلی کھا رہا تھا۔ گیت کے بول میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ لیکن آواز کا جادو ہی جل کی جھیل میں ہلچل مچانے کے لیے کافی تھا۔ رات چپ چاپ گزر رہی تھی۔ اور میں صبح کا انتظار کر رہا تھا۔

اُس صبح کی بھی ایک دلکش کہانی ہے۔ میں اپنے خیمے کے باہر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اچانک چوڑیوں کی کھنک نے میرا قلم تھام لیا۔ اور میری نظریں کاغذ پر سے پھسلنے لگیں۔ اور پھسلتے پھسلتے نرم گھاس پر سے ہوتی ہوئی دو خوبصورت پاؤں پر جم گئیں۔

اور میں نے دیکھا

اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

بالوں کا ایک آبشار تھا۔ کل کل کرتا ہوا۔

دو جھیل سی آنکھیں تھیں گہری گہری۔

دو پھول سے عارض تھے گلابی گلابی۔

دو ہونٹوں کی تحریریں تھیں سُرخ سُرخ۔

دو . . . . .

رک جاؤ !

میرے سلیٹی قلم رک جاؤ۔ کہیں تحریر بے ہوش نہ ہو جائے۔

"یہ میری بہن ہے انیتا !"

انل نے کہا۔

انل اور میں صبح ہی دوستانہ گئے تھے۔ آدمی چند روز گزارنے کے لئے آیا ہو۔ کسی پہاڑی مقام پر اور موسم دلکش ہو اور بہتے پانی کی موسیقی کانوں میں رس گھولتی ہو تو وہ اپنی دوست ہی ہو جاتے ہیں۔ تاکہ آدمی جی بھر کے قدرت کی صناعی کی داد دے سکے۔ مگر انل اور میں صرف اسی جذبے کے تحت دوست نہیں بنے تھے۔ شطرنج کے باہمی شوق نے ہمیں دوست بنایا تھا اور ہم باری باری ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ اور ہم مہروں کے کھیل میں اتنے محو ہو گئے تھے کہ جہاں اور شیو کر تک بھول گئے تھے۔ یہاں تک کہ سورج چیل کی پھنگیوں کے اوپر چڑھ آیا۔ اتنے میں انیتا چائے لے کر آ گئی تھی۔

"یہ میری بہن ہے انیتا — اور یہ شیو —"

انل نے کہا

اور میں چائے کی خوبصورت پیالیوں کی طرف دیکھنے لگا جن میں سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ بھاپ کے ساتھ ساتھ میری نظریں اوپر اٹھنے لگیں۔

اور پھر اُنکی نظریں جھک گئیں اور مجھے یاد آیا کہ میرے بادشاہ کو شہزادی سے ہیں
نے تیلی جھکاتے ہی اتالیق کے سامنے کو سلام کیا۔

اور تمہی کا جواب چند لفظوں کی مختصر سے دیا۔

میرے اندر ـــــ بہت اندر ـــــ چند دریچے وا ہوئے۔ دریچوں
کے اس اچانک کھلنے کو محبت تو نہیں کہتے؟

آؤ! تمہیں گلے لگاؤں میری محبت کے پہلے گلاب!

میں نے تمہیں پہچانا۔

اس نے دوبارہ شہزادی اور میرا اقرار نامہ لیا۔ شہر میں سکوت قائم رہی
اور میں نے دیکھا کہ مجھے رات ہو گئی ہے

شام کو جب اس اتم اور میں ندی کے کنارے بیٹھے تھے۔ اور جب تم اپنے شاعروں پرستاروں کی گفتائیں نہ ٹیگور کی کا گیت سنا رہی تھیں اس وقت بھی میں اپنے دل میں کھلتے ہوئے نوخیز گلاب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ اپنے ہی دل میں کھلے ہوئے گلاب سے ڈر لگ رہا تھا۔ کہتے ہیں آنے والے واقعات اپنا سایہ پہلے ہی ڈال دیتے ہیں۔

پھر تم نے مجھے ٹیگور کے بنگالی گیت کا ترجمہ انگریزی میں سنایا تھا۔ لیکن میں تمہاری آواز نہیں سن رہا تھا۔ تمہارا گیت نہیں سن رہا تھا میں صرف ، وہ موسیقی

سُن رہا تھا۔ جو تمہارے سینے میں تھی۔ دو جھیلوں کی گہرائیوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں گناؤں کے پیچ وخم کو دیکھ رہا تھا۔ میں اُن خوشبوؤں کو سونگھ رہا تھا۔ جو میری نس نس میں رچ بس رہی تھی۔ پھر نہ جانے تم نے میری آنکھوں میں کیا دیکھ لیا تھا نہ جانے میرے من میں کیا پڑھ لیا تھا۔ نہ جانے کس جذبے نے تمہیں خبر دی تھی۔ اور تم یکبارگی چپ ہو گئی تھیں۔

ہائے آدمی اپنے راز کو کس طرح عیاں کر دیتا ہے!

اُس کے بعد تمہاری ہر حرکت سے بے چینی کا اظہار ہونے لگا!

انیتا! تم سچ بتاؤ اُس دن تمہاری بے چینی کا سبب کیا تھا۔ اور جب انل نے وہ کہانی سُنائی تھی کہ کس طرح پُرانے وقتوں میں بنگال کی کنواریاں اپنے کنوارپن کے زہر سے تنگ آکر کسی براہمن کے گلے میں جے مالا ڈال کر اپنے آپ کو سہاگن تصور کرنے لگتی تھیں۔ تو تم اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھیں۔ تمہارے چلے جانے کے بعد میں اپنا قرار کھو بیٹھا تھا۔ تمہیں کیسے بتاؤں کہ میں نے اپنے اس قرار کو کن نازک مرحلوں سے بچایا تھا۔ کیا اسی دن کے لئے بچایا تھا!

تمہیں اپنے دل کے اندر ٹٹول کر اس سوال کا جواب دینا ہوگا انیتا!

"انل! تم نے شادی کیوں نہیں کی ہے؟"

اُس دن چندن واڑی سے آتے آتے میں نے انل سے پوچھا تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتا انیتا نے اپنی پونی قریب لا کر کہا۔

"اس نے کبھی بھی نہیں ہنسی ہے!"

"اور تم ---- تم نے کیوں نہیں کہا ہے؟"

"میں بتاتا ہوں، انیتا کو مردوں سے نفرت ہے۔"

انل نے کہا۔

اور میں نے ایک زور کا قہقہہ مارا۔ مگر انل اور انیتا کی نظروں نے میرے اس قہقہے کو میرے ہونٹوں پر منجمد کر دیا۔ ہم سب گھوڑوں سے نیچے اتر آئے۔ اور ایک کل کل کرتے ہوئے جھرنے کے کنارے بیٹھ گئے۔ نہ جانے ہم سب کیوں یک لخت خاموش ہو گئے تھے۔ ہم چپ چاپ جھرنے کے کنارے بیٹھے رہے۔ لمحے بیت گئے۔ چند جاں لیوا لمحے اور اس کے بعد انل نے کہا۔

"دادا! میں تمہیں ایک کہانی سناؤں گا۔"

"ہوں!"

"ایک بنگالی نوجوان تھا۔ بے چارے کا باپ مر گیا تھا۔ اس کی ایک ماں تھی جو گھر کے کمرے میں پڑی رہتی تھی ——"

انل نے کہنا شروع کیا

اور انیتا اٹھ کے ٹہلنے لگی۔

ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گئی۔

میں خاموش رہا۔

"بنگالی نوجوان ایک سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔ ایک دن نوجوان

کی ماں نے اُس سے کہا۔ اپنی بہن کے لئے کوئی شریف سا لڑکا تلاش کرو، کیوں کہ جوان لڑکی کی ماں تب تک انگاروں پر لوٹتی ہے جب تک اُس کی لڑکی کے ہاتھ پیلے نہ ہو جائیں۔ بھائی نے اپنی بہن کے لئے لڑکا تلاش کیا۔ لڑکا نیک، ایماندار سا تھا۔ اور شریف خاندان کا تھا۔ اور ایک سرکاری دفتر میں ایک بڑا افسر تھا۔ بات چیت کا سلسلہ چل پڑا۔ ایک دن وہ لوگ لڑکی دیکھنے کے لئے آ گئے۔ "تم سُن رہے ہو نا؟"

"ہاں ــــــ"

"بھائی نے بہن سے کہا، وہ چائے لے کر اندر آئے۔ تاکہ وہ لوگ اُسے دیکھ سکیں کیا کرتا رواج ہی ایسا تھا۔ اُس کی بہن چائے لیکر اندر آ گئی۔ وہ بہت گھبرا رہی تھی۔ وہ چائے میز پر رکھ کر جانے لگی۔ تو دیکھنے والوں کے ساتھ آئی ہوئی ایک عورت نے کہا۔

"کہاں جا رہی ہو بیٹی۔ تمہیں گانا وانا نہیں آتا؟ کچھ تو سناؤ۔"

بہن نے بھائی کی طرف دیکھا۔

لیکن بھائی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ کیا کہتا بے چارہ۔ بہن دوسرے کمرے سے ستار لائی اور اُنہیں گانا سنایا۔ گانا سنا کر وہ جانے لگی۔ تو اُسی عورت نے کہا۔ ٹھہر جاؤ بیٹی! ذرا اپنے بال کھول دو۔"

بہن نے بال کھول دیئے اور پھر چلنے لگی۔

بھائی نے چوری چھپے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

"اِدھر آؤ بیٹی! کیا نام ہے تمہارا؟"

"کہاں تک پڑھا ہے تم نے؟"

"چھپا ہوا اخبار پڑھ لیتی ہو؟"

"سفید کپڑوں کو نیل پانی سے دھوتی ہو یا سرف سے؟"

"طبلے پر تین تال بجا سکتی ہو؟"

"ذرا کھانڈ گھی کے بھاؤ تو بتا دو.."

اور ان تمام سوالوں کے دوران بھائی سوچ رہا تھا کاش! وہ کبھی ڈھنگ کا بھائی نہ ہوتا تاکہ کیدوؤں کے دربار میں وہ بہن کا یہ چیرہرن ہوتے نہ دیکھتا۔

اُنہیں ساری باتیں پسند آئیں لیکن چہرے کے تاثرات کی سطح سے نیچے آتا پسِ منظر آیا۔ بے چارہ لڑکا بھائی کیا کرتا۔ بہن نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا یکسر منظور نہیں ہوا۔ اور اس کے بعد اتنا وہ مہینے کے بعد ہی اور پھر ایک دفتر میں ایل ڈی سی ہو گئی۔

"اب اپنے ساتھ قہقہہ لگاؤ دادا!"

لگاؤ قہقہہ ـــــ دادا!"

انیتا! تم نہیں جانتیں کہ جب تم ٹہل کر واپس آگئیں تو میں اندر ہی اندر کن دائروں سے گزر رہا تھا۔ تم میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر حیران سی رہ گئی تھیں

تمہیں میرا سراپا دیکھ کر اچنبھا ہوا تھا۔ اور تمہاری آنکھوں میں ایک سوال ابھر آیا تھا
لیکن میری آنکھوں نے وہ سوال پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔
کیوں کہ دھندلے چند دبیز پردوں نے میری آنکھوں سے ہر سوال کو چھپا دیا تھا۔

اور کل شام تم اسی سوال کا جواب لینے میرے پاس آئی تھیں۔

ہاں کل شام ہی کی تو بات ہے۔

میں اپنے قصبے کے باہر چیل کے درخت سے ٹیک لگائے نہ جانے کن سوچوں میں ڈوب گیا تھا اور ستاروں کی مدھم روشنی میں اپنے دل کو کھلی [illegible] نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ کہ تم چپ چاپ آ کے میرے سامنے بیٹھ گئی تھیں شاید [illegible] آنکھیں تم تھیں۔

شاید میں کچھ کچھ اداس بھی تھا۔

نہ جانے کسی کی محبت اداس کیوں کر دیتی ہے۔

تم نے بہت دیر چپ سادھ کر کہا تھا۔

"تمہیں بہت محبت کی تمنا ہے؟"

میں چونک اٹھا تھا۔ تم کیسے جان گئی تھیں کہ میں تم سے بہت بہت محبت کرتا ہوں۔ تم نے کس طرح میرے دل کی گہرائیوں سے وہ موتی نکال لیا تھا؟

میں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔

کیسے کہتا کہ مجھے تم سے بے اندازہ محبت ہے۔ یہ محبت کا انداز

اتنا حسّاس ہو گیا ہے کہ میں اسے زبان سے ادا ہی نہیں کر سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے زبان پر آبلہ پڑ جائے گا۔

"کیسی محبت ہے یہ تمہاری ؟"

تم نے سرگوشی میں پوچھا تھا۔

"بہت گہری — بہت ہی گہری !" میں نے بھی سرگوشی ہی میں جواب دیا تھا۔

اور تم چند لمحوں کے لئے مسحور سی ہو گئی تھیں۔

لیکن صرف چند لمحوں کے لئے۔

اور اس کے بعد تم نے کہا تھا

"لیکن مجھے تم سے نفرت ہے ! — ہر مرد سے نفرت ہے !!"

انیتا ! تم ابھی تک سوئی نہیں ؟

میں جانتا ہوں تمہارے اندر کون سے طوفان اٹھ رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں اسی جگہ نیم تاریکی میں بیٹھ کر اپنے ارمانوں کی گرہیں کھول رہا تھا۔ تو تم دبے پاؤں میرے پاس آکر بیٹھ گئی تھیں۔ میں نے تمہاری طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"اب بات بھی نہ کرو گے ؟"

تم نے دھیرے سے کہا۔

رانا پھر بھی چپ رہا۔

"اس لئے تمہیں میری کہانی سناتی ہوں۔ لیکن ادھوری۔ باقی حصہ سنئے گا۔ میں نے یہ حصہ آج تک کسی سے نہیں کہا ہے"

میں نے پھر بھی کچھ نہ کہا۔

صرف ٹکر ٹکر تمہاری طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر آپ نے خود ہی کہنا شروع کیا ——

"ایک دن جب میں باہر جا رہی تھی۔ یہ انہیں دنوں کی بات ہے وہ لڑکا مجھے پھر ملا تھا۔ وہی جو مجھے شادی کے لئے دیکھنے آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا، 'تم مجھے بہت پسند آئیں۔ اپنے بھائی سے کہو وہ کہیں سے دس ہزار روپے ادھار لائے۔' مجھے غصہ آگیا میں نے تقریباً چیخ کر کہا، 'تمہیں شرم نہیں آتی؟' وہ کہنے لگا 'کیا کروں میری ماں مانتی ہی نہیں۔ مجھے تو پیسہ بہت بڑی چیز ہے۔ میں مجبور ہوں۔' پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وہاں کھڑے کھڑے ہی میری آنکھوں سے گنگا بہہ نکلی۔ میں نے کچھ نہ سوچا میں دوڑی دوڑی کالی کے مندر گئی۔ اور سوگند کھائی۔ کہ میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔ اور ہر مرد سے نفرت کروں گی!

اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟

تم بولتے کیوں نہیں۔ تمہاری یہ خموشی مجھے جلا کر راکھ کر دے گی۔"

میں کیا بولتا؟

بولنے کے لئے رہا ہی کیا تھا۔

میں نے دیکھا تمہاری آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے باہر چھلک پڑے اور پھر تم انہیں چھپاتی وہاں سے چلی آئیں۔

اچھا! تم جا کے سو جاؤ۔ تمہیں جل کر راکھ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم نے سوگندھ کھائی ہے۔ میں نے محبت کی ہے۔ میں شنکر کی طرح تمہارا سارا زہر خود پی لوں گا۔

کل صبح تمہارے جاگنے سے پہلے ہی میں یہاں سے جا چکا ہوں گا

دور ——— بہت دور ——— !!

اب تم جا کے سو جاؤ ——— سو جاؤ !! ——— سو جاؤ !!!

پردہ نشین

یکایک بجلی کا کوندا ہوا۔ بادل زور سے گرج اٹھے اور ساتھ ہی بارش کی پھوار نے ٹین کی چھت پر جلترنگ سا بجانا شروع کر دیا۔ زینب نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی اور شیشے کی کھڑکی سے باہر برستی بارش کی رم جھم میں کھو گئی۔ اُف، جب گھنگھرو باندھے میگھ کی دیوی ناچنے لگتی ہے۔ تو ایسا کیوں لگتا ہے۔ جیسے دل کے زخم پر کسی نے انگلی رکھ دی ہو۔ مگر یہ سوچنا گناہ ہے۔

اُس نے دوبارہ کتاب اٹھائی اور بظاہر اُس کی سطروں میں محو ہو گئی۔ امتحان میں اب صرف بیس دن باقی رہ گئے ہیں۔ پر یہ بارش یوں لگتی ہے جیسے سیپی کے کٹورے میں موتی رکھ کر کوئی بلا رہا ہو۔ ہشت! یہ دماغ خواہ مخواہ بہکا جاتا ہے۔

نورجہاں کی ماں کا نام بی بی عزت بیگم تھا۔ بی بی عزت بیگم کیسا غیر شاعرانہ نام ہے۔ بیٹی کا نام مہرو جہاں ہوتا یا کم از کم عشرت جہاں ہوتا۔ نورجہاں کی ماں کا نام تو

بس ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ کتنی محبت تھی سلیم کو اُس کے ساتھ۔ لوگ آج بھی کہتے ہیں۔ کہ بادشاہوں کے دل نہیں ہوتا۔ تاج محل کو دیکھیے۔ اتنا عظیم کارنامہ محبت کی ابدیت اور عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت، ہے کوئی جو اس حقیقت کو جھٹلا سکے؟ نہیں نہیں، محبت گناہ ہے۔ کنواری لڑکی کو ان حدود میں سوچنے کی اجازت نہیں۔ آخر کیسے محبت ہوتی ہوگی لوگوں کو؟ بس کسی کو دیکھ لیا اور محبت ہوگئی۔ ہُنھ! بکواس ہے سب کچھ۔ سلیم جیسے اوباش اور شرابی شہزادے سے کوئی کیسے محبت کر سکتا ہے آوارہ مزاج تو بڑے درجے کا تھا وہ۔ اوہ، یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ توبہ!

نورجہاں کا اصلی نام مہرالنساء تھا۔ اور ——— مگر یہ بارش تو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ سوال دہرایا نہیں جا سکتا۔ اور ابھی وہ مسخرے کا باپ آتا ہوگا، کیسا بے ڈھنگا آدمی ہے وہ بھی۔ کبھی کپڑے پہننے کا سلیقہ نہیں آئے گا اُسے۔ جیسے خود نہیں پہنتا، کوئی زبردستی اُسے کپڑے پہنا دیتا ہے۔ ہو ہو ہو! جانے اس کی بیوی کیسی ہوگی۔ ابھی پچھلے ہی دنوں تو اس نے کہا تھا کہ اس کی شادی نہیں ہوئی ہے کنوارا رہے گا۔ عمر بھر کوئی لڑکی اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرے گی۔ ناک دیکھو بہت بڑی، جیسے کسی نے گرما گرم پکوڑا رکھ دیا ہو۔ سوں سوں کرتا ہوا منھ تو کبھی پیار بھرا لگتا ہی نہیں۔ خدا جانے پڑھاتا ہی نہ ہو۔

اللہ! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے آج؟ اس ایک گھنٹے میں دو سطریں بھی نہیں پڑھ سکی ہوں۔ دراصل اب یہ دماغ تھک گیا ہے تو کوئی مذاق ہے۔ صبح سے شام تک پڑھتی رہتی ہوں۔ دماغ بھاگ جائے تو کیا ہو۔ دماغ بھاگ جانا اور درد دماغ [illegible] ان دو چیزوں میں کیا فرق ہے؟ اُف! بھول گئی ہیں۔ ارے اتنی سی بات

بھی یاد نہیں رکھ سکی: پچھلی ہی جمعرات کو بتا دیا تھا: ماسٹر نے - اور میرے جی میں آئی تھی - کہ کہہ دوں : پڑھاتے پڑھاتے آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ ایسے :! اگر میں سچ مچ کہہ دیتی تو ؟ ---- تو ---- ؟

نور جہاں کی شادی شیر افگن سے کر دی گئی۔ شیر افگن یعنی شیر کو مارنے والا جانے نور جہاں کو اس کے ساتھ محبت تھی یا نہیں ؛ شوہر جو تھا اس کا - شوہر کے ساتھ محبت تو ہر ایک کو ہوتی ہوگی - خاک ہوتی ہے - بوا رحمین کی اور نظیر چچا کی بک بک تو روز ہی گھر میں ہوتی ہے - نظیر چچا کہتے ہیں کہ میاں بیوی میں یہ آئے دن کی بک بک نہ ہو تو زندگی کا خاک مزہ آئے چھوڑو جی ، یہ بھی کوئی زندگی ہوئی - کہ چوبیس گھنٹے بک بک کرتے رہو - تنگ نہ آجائے آدمی :"

امی تو اس سلسلہ میں بڑی خوش نصیب واقع ہوئی ہیں - کبھی ابا کے ساتھ جھگڑا نہیں کرتی ہیں - اور نہ وہ کرتے ہیں - امی کی مرضی تو نہیں تھی - مجھے سکول یا کالج بھیجنے کی ابا جیسے ملتے ، ضد کرنے لگے - مگر امی تھیں کہ مرنے کی ؟ ایک ہی رٹ - اللہ لڑکی کو کالج بھیجا ہے - شرم بھی کوئی چیز ہے - تایا یا کالج وغیرہ میں لڑکیاں بے پردہ ہو جاتی ہیں خدا نہ کرے جو ہمارے گھرانے کی بیٹیاں بے پردہ ہو جائیں - غصہ ہی تو آ گیا تھا ابا کو - لیکن پھر خود ہی امی کی بات مان گئے بہت برا کیا جو امی کی بات مان گئے - میں تو تنگ آ گئی ہوں اس چار دیواری میں جدھر دیکھو دیواریں ، جدھر دیکھو چلمنیں - گھر نہ ہوا قید خانہ ہو گیا - ابھی کل ہی ساجدہ کہہ رہی تھی - کہ ان کے کالج میں بادام کے پیڑ پر شگوفے پھوٹ آئے ہیں - میرا تو جی مچل گیا تھا دیکھنے کو - پر توبہ کرو - اماں سنیں تو کھا ہی جائیں - میں

بھی جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہوں۔ ابھی ماسٹر آئے گا تو اُسے کیا سناؤں گی؟ سب سے پہلے وہ مجھ سے تاریخ ہی کے سوال پوچھے گا۔ جانے وہ تاریخ کے سوال کیوں پوچھتا ہے۔ پوئٹری پڑھاتے پڑھاتے تو اُس کے کانوں کی لَویں تک سُرخ ہو جاتی ہیں۔ خاص کر بائرن اور شیلی پڑھاتے وقت۔ ہائے اللہ! کس قدر شرماتا ہے۔ مجھ سے تو ہنسی روکنی مشکل ہو جاتی ہے۔ ترس آتا ہے بے چارے کی حالت پر۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے گلے میں پھندا ڈال دیا ہو۔ ہشت۔ بے چارہ وہ بھی تو کسی کی آنکھ کا نور ہو گا۔ کسی کے دل کا قرار ہو گا۔ اُف! کس قدر عامیانہ جملے۔ ایسے جملے تو ان پڑھ اور گنوار لڑکیاں بھی کہتی ہوں گی۔ چلو ان پڑھ اور گنوار لڑکیاں پھر بھی بہتر ہیں۔ گھر کی چار دیواری میں پڑھانے پڑے مسٹر تو نہیں جایا کرتیں۔

یہ بارش بھی غضب کرتی ہے۔ جیسے بارش کے قطرے نہ ہوئے موسیقی کی لہریں ہوئیں۔ جیسے ٹین کی چھت نہ ہوئی وائلن کے تار ہوئے۔ یہ وائلن بھی کیا خوب چیز ہے۔ ڈھنگ سے بجانے والا ہو تو آدمی جھوم ہی تو جاتا ہے۔ ہاں بجانے والا ڈھنگ سے بجاتا جاتا ہو۔ جیسے کسی فلم کا ہیرو، ایک محبت کرنے والا جان کی قربانی کرنے والا ہیرو۔ کتنا عامیانہ مذاق ہے ان لوگوں کا بھی! ارے صاحب! وائلن بجاؤ تو کیا یہ ضروری ہے کہ کوئی لڑکی ضرور سنے؟ اور اُس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوں۔ کتنا غلط تصور ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تو تیز نہیں ہوتیں۔ جب میں ریڈیو پر وائلن سنتی ہوں تو دل کی دھڑکن تو اُس وقت تیز ہو جاتی ہے۔ جب بادل زور سے گرجتے ہیں۔

ہے یہ تاثیر کی بات۔ اس بات کو کیا کہتے ہیں؟ اُف ماسٹر نے تو بتا دیا تھا۔ یہ کھلی بات کا ہے ہی مجھ میں جو بگڑ گیا ہے۔ ہاں! سطحی مشاہدہ، واقعی سطحی مشاہدہ ہے یہ مشاہدہ یا مطالعہ؟ شاید مطالعہ ہے۔ خیر جانے دو۔ امتحان میں آنے کی چیز تو ہے نہیں جو آدمی دماغ پر زور ڈال کر یاد کرے۔

یہ ماسٹر بھی عجیب مخلوق ہے مجھے طوطے کی طرح ہر چیز رٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ میرا دماغ سیاہی چوس نہیں۔ مگر کوئی ملتے بھی۔ پھر وہ بھی تو بھلائی ہی کے لئے کر رہا ہے۔ میں ہی تو آخر امتحان میں پاس ہو جاؤں گا۔ وہ تو نہیں ہوگا۔ یہ لوگ بھی کتنے بے غرض ہوتے ہیں۔ دوسروں کو پڑھاتے ہیں، دوسروں کو پاس کراتے ہیں اپنا سر کھپاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ پیسے لیتے ہیں۔ اب دنیا میں ہر ایک چیز پیسے سے ہی تو نہیں خریدی جا سکتی اس نگوڑی محبت کو ہی لیجئے۔ لوگ کہتے ہیں یہ ہو جاتی ہے۔ کی نہیں جاتی خریدی نہیں جاتی۔ اب یہ تو بتائیے جناب!! ہو جاتی ہے۔ جیسے محبت نہ ہوئی نمونیہ کی بیماری ہوگئی!

جہانگیر کشمیر میں مر گیا تھا۔ لو! مر گیا جہانگیر بھی۔ کیا نام تھا اس کا۔ ہاں سلیم! سلیم کی بیوی تو انارکلی تھی۔ نہیں نہیں!! انارکلی تو ایک خادمہ تھی جس کو سلیم کے ساتھ محبت ہو گئی تھی۔ اب یہ بات کوئی کیسے مان لے کہ ایک خادمہ کو ایک شہزادے کے ساتھ محبت ہو جائے۔ پر اس کا کیا! ہو جاتی ہے یہ کمبخت۔ اور پھر درمیان میں 'یا گو' آجاتا ہے۔ نہیں نہیں!! ولن آجاتا ہے۔ جانے کیوں درمیان میں آجاتا ہے یہ؟ کوئی زبردستی تو نہیں کمبخت

لاتا ہے، اسے عیب کہ آخر میں مرنا بھی پڑتا ہے۔ بے چارے کو۔ چچ چچ!
اس دن حمیدہ نے اس فلم کی کہانی سنائی تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟ جانے کیا تھا!
میں آجکل بھی گئی۔ اس میں بھی ہیرو آخر میں مرجاتا ہے۔ یہ ولن دراصل کمزور
ہوتا ہے گا۔ سوکھا سوکھا سا، مریل، ہڈیوں کا پنجر۔ دھت تیرے کی! جیسے ولن
نہ ہو بھاڑے کا ٹٹو ہو گیا۔

تو یہ میری: ابھی ماسٹر آجائے گا اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں گی۔ مجھے تو ویسے
بھی اس سے نفرت ہے۔ کتنا بدصورت آدمی ہے۔ جانے ابا اسے کہاں
سے ڈھونڈ لائے، مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ مجھے اس سے نفرت ہو جائے
گی۔ ہاں مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ اس کے کپڑوں سے اس کی
باتوں سے۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے کے طریقوں سے۔ اُف! چائے پیتا
ہے تو منہ سے ایسی آواز نکالتا ہے۔ جیسے سیٹی بجا رہا ہو۔ یہ نفرت کا جذبہ
بھی، شدید ہوتا ہے۔ اگر میرے سامنے کوئی اس کے بید لگائے
تو میں آنکھ بھی نہ جھپکوں۔

مگر کوئی کیوں بید لگائے اس کے؟ ہر ایک۔ اس سے نفرت
نہیں کرتا ہوگا۔ ایک میں ہوں جو اس سے نفرت کرتی ہوں۔ نفرت محبت
تو نہیں جو صرف ایک آدمی سے کی جاتی ہے۔ ہاں! کیا میں صرف اسی سے نفرت
کرتی ہوں؟ باقی بھی تو ہیں، ابا ہیں امی ہیں۔ بزرجمن ہیں، نظیر چچا ہیں یوسف
بھائی ہیں۔ اب کتنے نام گنواؤں، پر ان کے ساتھ تو میں نفرت نہیں کرتی
صرف اسی ماسٹر کے بچے کے ساتھ کرتی ہوں

کیا واقعی نفرت کرتی ہوں ؟؟

چلو جانے دو۔ پڑ ہی جاتا ہے یہ دورہ کبھی کبھی مجھ پر۔ میں سوچنے لگی تھوں
تو سوچے ہی چلی جاتی ہوں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ ابھی اس دن تو آئینے کے ساتھ
بھی باتیں کر ڈالیں۔ حمیدہ کہہ رہی تھی۔ کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ میرا جسم متناسب
ہے اور، اور بے شرمی کی باتیں ہیں یہ سب! وہ تو بڑی بے شرم ہو گئی ہے
کہہ رہی تھی کہ مجھے اچانک کوئی بے خبری میں دیکھے تو فلیٹ ہو جائے۔ میری
جوتی سے فلیٹ ہو جائے۔ مجھے کیا؟ اُس دن تو میں نے دیر تک آئینے
کے ساتھ باتیں کی تھیں اور سوچ رہی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری کنپٹیوں
پر میٹھا میٹھا ساز بج رہا ہو۔ جیسے میرے سارے بدن کو دھیمی دھیمی آنچ لگ رہی
ہو جیسے میرا گوشت پھڑک رہا ہو جیسے میرے گالوں پر آگ سی دہک رہی ہو
اُف اتنا مجھے کتنا پسینہ آ گیا تھا۔ میری قمیص تک بھیگ گئی تھی۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی اگر
دن کو کوئی روگ ہی نہ ہو۔ جب مجھے نا گہاں لگ گیا ہو۔ میں نے سوچا تھا میں صبح
سویرے ہی امی سے یہ سب کہہ دوں گی۔ اور میں واقعی کہہ بھی دیتی۔ اگر صبح ہی صبح
وہ حمیدہ کی بچی نہ آ جاتی اور میں اُس کو یہ سب باتیں نہ سنا دیتی۔ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ
ہو گئی تھی۔ وہ یہ سب سُن کر۔ توبہ! کتنی گندی لڑکی ہے وہ بھی۔ کہنے لگی تھی کہ تجھے فوراً
امی سے کہہ دینا چاہیے۔ کہ میری شادی کر دیجئے۔ نگوڑی بے شرم! واقعی کالجوں
میں جا کر یہ لڑکیاں شرم بھول جاتی ہیں۔ شرم و حیا ہی تو ہم لڑکیوں کا فطری زیور ہے
اُف میرے اللہ! اب بھی بالکل وہی کیفیت ہے۔ یہ ہلکی ہلکی آنچ
تو مجھے جلا کر راکھ کر دے گی۔ یہ دیا دیا درد تو میری ہڈیاں چوس کر دم لے گا۔ یہ میٹھا

بیٹھا سارا تو میری ہڈیوں کا خون نچوڑ دے گا۔ جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر سارے کپڑے اتار دوں۔ اور بارش میں کھڑی ہو جاؤں۔ یا دریا کے پانی میں کود پڑوں یا اُس کی چھت سے لپٹ جاؤں۔ اتنی بارش ہو رہی ہے لیکن پھر بھی اتنا حبس ہے جیسے آگ برس رہی ہو۔ تاج محل کے مقبرے میں بھی حبس ہوگا۔ سلیم کے دل میں بھی حبس ہوگا۔ انارکلی کا دل بھی جل رہا ہوگا۔ نہیں، اُس کا دل نہیں جل سکتا۔ وہ تو پتھر ہو گیا تھا اسی دن جب اُسے دیوار میں چنوا دیا گیا تھا۔ نورجہاں کی ماں کا نام بی بی عزیزن تھا۔ نہیں، مہر جہاں تھا۔ شاید عصمت جہاں ہو۔ مگر یہ بیچ دل میں جھگڑا کیوں آ گیا ہے؟ یہ تانگوں اور بازاروں میں الجھن کیوں ہو رہی ہے؟

جی چاہتا ہے کوئی اٹھا کر مجھے اس کھڑکی سے باہر پھینک دے نیچے میری ہڈیاں پسلیاں ایک ہو جائیں۔ شیر افگن کو قتل کر لینے پر جہانگیر کا ضمیر تھا۔ جھوٹ! نہیں یہ سچ ہے۔ یہ انارکلی؟ وہ تو اُس کی بیوی تھی۔۔ ہشت۔۔ اُس کی بیوی نورجہاں تھی۔ نورجہاں جو مقبرے میں قید ہے کتنا حسین ہے جیل والے بھی یہ مقبرہ۔ گرا دو مجھے اس کھڑکی سے۔ توڑ ڈالو میری ہڈی پسلی پھینک دو مجھے جیل کی گہرائیوں میں۔ مگر یہاں کون آئے گا۔ ان چلمنوں سے اس پار!

کون آئے گا؟

ابا تو نہیں آئیں گے۔

بھیا بھی نہیں آئیں گے۔

نظیر چچا بھی نہیں آئیں گے۔

پر ماسٹر جی ہنسے گا۔ ماسٹر جی! میں آج نہیں پڑھوں گی۔ میرا جی نہیں چاہتا پڑھنے کو۔ بس آج آپ مجھے اُٹھا کر اس کھڑکی سے باہر پھینک دیجئے۔ اُٹھائیے نا! میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ میں آپ سے لپٹ جاؤں گی۔ اگر آپ نہیں مانیں گے تو۔

اُف ہا! ---- میں جل رہی ہوں۔ --

اُٹھائیے مجھے!

اس کھڑکی سے باہر پھینک دیجئے۔

ہاں: ---- ---- ایسے!! ----

اب میں ہوا میں سے گزر رہی ہوں۔ ابھی ایک لمحے میں ایک دھماکا ہوگا۔ ستارے ٹوٹ پڑیں گے۔ کائنات بکھر جائے گی اور میری ہڈی پسلیاں چکنا چور ہو جائیں گی۔

پھر سکون ہوگا ----

ٹھنڈک ----

مقبرے کی سی!!

کھٹ ---- کھٹ ---- کھٹاک ----!!

دروازے کے دونوں پٹ کھول کر، ماسٹر نے اپنی برساتی اتار کر اندر نظر دوڑائی ---- اندر اس کی شاگرد تکیے کو گود میں لئے سو رہی تھی ----

اور باہر بارش بدستور ٹین کی چھت پر تال دے رہی تھی۔

غیر حاضر

سچے شرما : دیدے پھاڑ پھاڑ کے اس طرح دیکھتا ہے جیسے آنکھوں ہی سے کھا جائے گا بے چاری کو گنج گانٹ نشی کیا ہوا یوسف شاہ چاک ہو گیا

ثریا :

تیس پچاس کے ملازم کیا ہو جاتے ہیں۔ کہ طبیعت جھٹ سے عشق کرنے پر تُل جاتی ہے۔ دیدہ دلیری تو دیکھو۔ یہ بھی نہیں سوچتا کم بخت، کہ اتنے آدمی دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ دھوبن کی بچی، اس سے بھی شاید اب جوانی سنبھالی نہیں جاتی۔ نگوڑی جوانی کیا آتی ہے۔ ان چھوکریوں کے پر پُرزے نکل آتے ہیں۔ بھگوان جانے کیا ہو گیا ہے زمانے کو، نہ شرافت، نہ حیا، نہ جھجک۔ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ ہائے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب یہاں کی عورتیں گھر کی چہار دیواری سے باہر قدم بھی نہ نکالتی تھیں۔ اب تو وہ باتیں خواب ہو گئی ہیں

فیشن کی دیا ۔ وہ ساری شرافت اور جھجک اور شرم و حیا لے اُڑی ہے وہ وقت ہی نہ رہا جب ہمارے ہاں کی عورتیں اپنے آنگنوں میں شالی کوٹتی تھیں چٹائیاں بنتی تھیں ۔ چرخا کاتتی تھیں ۔ اور شام کو دئیے کی روشنی میں بچوں کو رستم پہلوان کی کہانیاں سناتی تھیں ۔ اور خدا کی عبادت کیا کرتی تھیں ۔ نہ جانے یہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا ۔ کسابے کی جگہ رومال نے لے لی ۔ فرن کی جگہ ساڑی آگئی مکھن کی بجائے سر میں سرسوں کا تیل لگایا جانے لگا ۔ اس حد تک تو ٹھیک تھا لیکن سرسوں کے تیل کی جگہ اب اناپ شناپ قسم کے تیلوں نے لے لی ہے جو طرح طرح کی خوشبوؤں سے معطر رہتے ہیں ۔ اور تو اور اب لڑکیاں بالوں کو ترشوانے بھی لگی ہیں ۔ ابھی کشیپ رشی کی اس سرزمین کو نہ جانے کیا کیا دیکھنا ہے ۔

ہٹاؤ میں بھی جانے کیا باتیں لے بیٹھا ہوں ۔ میرے راشن ٹکٹ کا نمبر ہی نہیں آتا صبح سویرے ہی تو نمبر پر لگا دیا تھا ۔ یہ گھاٹ منشی کا بچہ بہت آہستہ آہستہ کام کرتا ہے ۔ یہ نہیں سوچتا کہ پبلک کو تکلیف ہوتی ہے پبلک کی پروا آج کل کون کرتا ہے ۔ پہلا گھاٹ منشی تو بس چٹا پٹ کام کرتا تھا ۔ میری طرح بے چارا اگلے وقتوں کا آدمی تھا ۔ چپ چاپ اپنے رجسٹر پر آنکھیں جمائے کام کرتا تھا ۔ یہ نئے نئے لونڈے تو بس مجنوں کے کان کترنے لگے ہیں اب کوئی اس سے کیسے کہے کہ میاں صاحبزادے تمہارا کام ابھی دھوبن کی بچی کی پنڈلیاں دیکھنا نہیں ہے ۔ راشن ٹکٹوں پر پبلک کو راشن دینا ہے ۔

لیکن یہ بھی کیا کرے بے چارہ : سامنے دیکھنے کی چیز ہو اور دیکھنے والے کے پاس آنکھیں ہوں تو بے ارادہ اُٹھ ہی جایا کرتی ہیں نظریں۔ تصور تو اس دھوبن کی بچی کا ہے، شلوار گھٹنوں سے اوپر چڑھالی ہے نفرن کے اوپر لہنگا سا باندھ لیا ہے جس سے جسم کے حسین خطوط اور زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں یہ ننگی پنڈلیاں تو، توبہ توبہ ! یہ بھی نہیں دیکھتی کہ گھاٹ پر اتنے غیر مرد بیٹھے ہیں پڑے ہی دم مرنے تھے تو بارہ بجے کے بعد آکر دھوتی۔ جب راشن کی سیل بند ہو جاتی ہے۔ اور جب گھاٹ ہنستی چلا جاتا ہے۔

بے حیا ہو گئی ہیں یہ عورتیں کچھ پروا نہیں کرتی ہیں ایسی باتوں کی۔ آخر مردوں کو کیوں مورد الزام ٹھہراتے پھریں؟ اور تو اور میں خود دفتر جاتے یا آتے وقت اپنی گلی کے موڑ پر نان بائی کی دوکان کے سامنے رک سا جاتا ہوں۔ غیر ارادی طور پر نگاہیں دکان پر بیٹھی ہوئی نان بائی کی بیوی کی طرف، اُٹھ ہی جاتی ہیں بے شرم ! سر کے پچھلے حصہ تک اوڑھنی کھسکا کر اس طرح بیٹھتی ہے۔ کہ دیکھتے ہی دل میں کسک سی پیدا ہو جاتی ہے۔ کم بخت خود تو اندر تنور کے پاس پڑا رہتا ہے اور بیوی کو دوکان پر بٹھائے رکھتا ہے۔ قسمت سے بیوی خوبصورت کیا ملی ہے۔ کہ اسے دوکان کا اشتہار بنا کے رکھ دیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں جو اس کی دوکان پر گاہکوں کی اتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ آج کل عورت ایک اشتہار ہو کر رہ گئی ہے میں ٹھہرا اگلے وقتوں کا آدمی۔ پھر نیا خون تو نیا خون ہے۔ کیسے جوش نہ مارے !

اخ ___ اخ ___ اخ ___

"دس میرے ولد رسل میر، پانچ نفر!"

"حاضر جناب!"

"کیا لینا ہے بھئی!"

"شالی اور چاول"

"آٹا نہیں؟"

"نہیں جناب!"

لسہ میری باری آگئی۔ شکر ہے۔ میرا تو اس کے بعد دوسرا نمبر ہے۔ جب تک سگریٹ ہی کیوں نہ منگا لوں۔ گھاٹ منشی جی تو سگریٹ پینے لگا ہے۔ دھواں دیکھو کس انداز سے بکھیرتا ہے کسی فلمی ہیرو کی نقل کر رہا ہوگا۔ ان فلموں نے تو رہی سہی کسر پوری کر دی ہے۔ اب تو دس سال کے بچے بھی سگریٹ پینے لگے ہیں۔ ہم پچیس سال کی عمر تک سگریٹ کا نام سننے سے کانپتا تھا۔ بزرگوں کا لحاظ ہوتا تھا۔ آج کل تو بزرگوں کی کوئی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ لو یہ بزرگ یہاں بیٹھے ہیں۔ مجال ہے کہ گھاٹ منشی سگریٹ پینے کی ہمت کرتا۔ پرانے وقتوں میں اتنی بے حیائی کہاں تھی؟ اب ان دھوبن کی بچی ہی کو لیجئے۔ مان لیا کہ نگاہ اٹھا کر کسی طرف نہیں دیکھتی ہے۔ مگر سٹا گھاٹ کے پتھر کو دیکھتی ہے جس پر کپڑے پٹکے جاتے ہیں۔ واقعی نظریں تو نیچی ہی رکھی ہیں بیچاری نے۔ آخر کیسے دیکھے ادھر ادھر اتنے لوگ بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ گھاٹ منشی کا بیٹا سوتا لگاتار اس کی طرف دیکھے جاتا ہے۔ توبہ! ان لوگوں کو شرم بھی نہیں آتی۔ ایسا ہی عاشق مزاج تھا کسی زمانے

ویٹر میں چلا جاتا ان تھیٹروں کی بھی الگ ہی بات ہوا کرتی تھی۔ اب تو تھیٹر سے ہم
کھوپ ہو گئے ہیں۔ ٹاکیوں نے گرد اڑا دی ہے۔ اُن دنوں تو کتنا شوق ہوا
کرتا تھا۔ لوگوں کو تھیٹر دیکھنے کا۔ خود بھی کئی بار چھپتے چھپاتے گیا ہوں۔
خاص کر جن دنوں شیریں جان کا تھیٹر آیا ہوا تھا۔ وہ اچھی شہرت میں تھی، گاتی تھی تو آسمان
کے تارے جگمگانا بھول جاتے تھے۔ ناچتی تھی تو معلوم ہوتا تھا آس پاس کی ساری
چیزیں ناچنے لگی ہیں۔ کیا چسکا تھا وہ بھی۔ ایک دن جب پاس کوئی پیسہ تک نہ
بچا تو چپکے سے پتاجی کے واسکٹ سے ساڑھے تین آنے چرا لیے اور پھر اس زمانے
کے ساڑھے تین آنے آج کل کے تیس روپے سے بھی کچھ زیادہ ہی ہوتے۔ واہ رے
کیا زمانہ تھا، ایک پیسے میں اوّل نمبر کے تین تین سگریٹ ملتے تھے۔ یہی حال
اور چیزوں کا بھی تھا۔ تنخواہیں بھی کتنی ہوا کرتی تھیں۔ اُن دنوں چودہ روپے
تو سپرنٹنڈنٹ لیتا تھا۔ لیکن اُن ہی چودہ روپوں میں برکت تھی۔ آج کل تو چپراسی
بھی ساٹھ کے قریب تنخواہ لیتا ہے اور مہینے میں دس دن تنگ رہا کرتا ہے
وہ برکت ہی اُٹھ گئی ہے۔ آخر کیسے نہ اُٹھتی۔ دن بہ دن بے حیائی اور بے
شرمی پھیل رہی ہے۔ زمانہ خراب نہ آ گیا ہوتا تو کیا یہ گھاٹ ماشٹی کا بچہ جیسے
مچھندر گھوڑے کے ایسے پیاری دلہن کو تنگ کرتا۔ نہ ہوا میں جوان نہیں تو
مزہ چکھا دیتا بچے کو۔ چھٹی کا دودھ یاد نہ دلا دیتا تو واہ۔ بڑھاپا نہ ہوتا۔ یہ جوانی
کتنی جلد بیت جاتی ہے۔ ایک طرح کا نشہ ہوتی ہے یہ جوانی بھی۔ کتنا جوش، کتنی امنگ،
کتنی سرمستی، جوانی کے دنوں میں کسی بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ ہائے،
وہ دلچسپیاں یاد آتی ہیں۔ اب تو خیر میری طرح بوڑھی ہو گئی ہے۔ سر کے بال

سفید ہو گئے ہیں۔ جھرّیوں نے حلیہ بگاڑ دیا ہے۔ لیکن جوانی کے دنوں میں دیکھنے کی چیز تھی۔ میں بھی بہت شریر تھا اُن دنوں تو ــــ تو ــــ تو ــــ

ایک دن شام کے وقت گوالوں کے ہاں دودھ لینے گئی تھی اتفاق سے میں بھی وہاں دودھ لینے گیا تھا۔ پوشہ گجی کو دیکھا تو دودھ لینا بھول گیا اور جب وہ دودھ لے کر جانے لگی۔ تو گلی کے اندھیرے میں اُس کے کوٹھے پر ایک چٹکی لی۔ وہ اوئی کہہ کر تلملائی اور میں بھاگ گیا۔ مگر مجال ہے جو اس واقعہ کا ذکر کسی سے کیا ہو۔ نہ اُس نے کیا اور نہ میں نے کیا۔ اُن دنوں شرم و حیا ہوا کرتی تھی۔ اور آج کل بے حیائی ہے۔

لوگ تھیٹر میں شیریں جان کو دیکھتے تھے۔ تو دل ہی دل میں آہیں بھرتے تھے۔ مگر مجال ہے جو زبان سے ایک لفظ بھی کہا جاتا۔ میں نے خود شیریں جان کے لئے کتنی ہی راتوں کو آنسو بہائے ہیں۔ مگر کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔

شیریں جان کی تو بات ہی اور تھی۔ ناچتی تھی تو گھٹنوں تک ٹانگیں ننگی ہو جاتی تھیں۔ یہ دھوبن کی بچی۔ اس کی ٹانگیں بھی بالکل ویسی ہی ہیں۔ دو منٹ لگاتار دیکھو تو پسینہ چھوٹ آتا ہے۔ نہ جانے یہ گھاٹ منشی کس طرح دیکھے ہی جاتا ہے۔ اور مر نہیں جاتا۔ میں جوان ہوتا تو نہ جانے کیا کرتا۔ جان پر کھیل جاتا۔ پرانے وقتوں کے جوان ایسے کہاں ہوتے تھے۔ پیار اور محبت کی خاطر جان پر کھیل جاتے تھے۔ وہ جوانی کے دن صرف ایک بار لوٹ آتے صرف ایکبار!

جب جنون کی گردش تیز ہو جاتی ہے تو یہ کانوں میں شائیں شائیں کا شور کیوں ہونے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اور کہیں بہت سارے آبشار ایک ساتھ گرنے لگے ہوں۔ یہ یہ تو جوانی کی علامتیں ہیں۔

"اری ہاں! ٹانگیں ڈھک لے۔ دیکھتی نہیں یہاں اتنے سارے جوان مرد بیٹھے ہیں ——!"

"ارے یہ جوان مرد بیٹھے ہیں تو کیا ہوا، کوئی کھا جائیں گے؟"

"ہاں ہاں کھا ہی جائیں گے اور کیا کریں گے۔ بے شرم کہیں کی!"

"میں کیوں بے شرم ہونے لگی۔ بے شرم ہوگی تیری میا!"

مجھے بہت غصہ آنے لگا ہے!

اور جب مجھے غصہ آجاتا ہے تو غضب ہو جاتا ہے۔ ذرے ذرے پر تھرتھری طاری ہو جاتی ہے۔ اور پھر جوان مرد کا غصہ! ہاں وہ پھر ملنے لگا ہے وہ کہاں شامت کا رجسٹر مڑ کر دریا میں گر گیا ہے وہ کشتی الٹ کر پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ گئی ہے۔ وہ دھوبن؟

ارے ابھی تو یہاں تھی —— شاید پیر پھسل گیا ہوگا۔

یہ دائرے! اُف، یہ پھیلنے لگے ہیں مگر نہیں یہ تو دھوبن کے بال ہیں جو کھل کر چاروں طرف پھیلنے لگے ہیں —— لہرانے لگے ہیں —— یہ آگ بجھاؤ اس آگ کو! نہیں یہ تو آنکھیں ہیں، سرخ آنکھیں، سرخ بھی کہاں، بھوری آنکھیں! مت دیکھو میری طرف۔

"واسدیو کول ولد ہری چند کول۔ سات نمبر!"

مت دیکھو میری طرف۔ ارے! یہ چنار کی شاخیں۔ ہو ہو یہ گرنے

ں ہیں۔ ہٹ تیرے کی، یہ تو ٹانگیں ہیں۔ کس کی ٹانگیں؟

شیریں جان۔ واہ واہ، ابھی تک جوان پہچان رہی!

• نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری —،

شوخ چنچل قسم کیا آوارہ پانی ہے۔ چھک چھک کر گاتا ہے۔ ہنس ہنس، ہک ہک

کر گاتا ہے۔ نہیں چھپک چھپک کر گاتا ہے۔

• داسدیو کول: امر ہری چند کول۔ سات، نقرہ،

• مجھے گدگدیاں سی ہو رہی ہیں —، ارے یہ میری جان جگ جگ

جیو۔ گدگدیاں: یہ تو شیریں جان نہیں ہے۔ یہ اُس کے کپڑے کیا ہو گئے؟

اب تو یہ بالکل ہی ننگی ہو گئی ہے۔ ٹھہر تو میں آیا۔ ہٹ راستے سے جگہ چھوڑ دو۔

یہ بلبلے پھر اُبھر آئے ہیں۔ رنگ کہاں ہیں۔ مت رو کو انہیں، یہ دھوبن کے

بال ہیں۔

بوڑھا کھوسٹ — ہو ہو ہو:

کھوسٹ تیرا باپ — تہ تہ تہ!

لو میں آیا — —

شوستنکر: تم تو بالکل ننگی ہو۔ یہ پانی بہت سرد ہے۔ نہیں پسینہ ہے۔

نہیں تمہیں پانی ہے۔ پھر ڈوب جاؤ۔ آؤ دونوں ڈوب جائیں۔ یہ نیلا پانی

ہے سرد سرد اور فرحت انگیز۔ یہ مچھلیاں: ہاں ہاں چھوٹی چھوٹی ڈھیں اُڑتی

ہوئی! — اب نیلاہٹ بھی نہیں اندھیرا ہے۔ چراغ جلاؤ —

مت جلاؤ چراغ — میں تھک گیا ہوں، تھکن، غنودگی، موت، مجھے

نغ مجھے! سونے دو مجھے!!

"ڈاکٹر لیلا کول ولد ہری چند کول، سات نمبر ایرے سے بچے۔"

"گنگادھر منشی نے چیخ کر آخری بار کہا اور دور کہیں سے آواز آئی۔

"غیر حاضر ———!"

گرداب

۲

دو دن سے برف لگاتار گر رہی ہے۔

اور دو دن سے درگا مجھے لگاتار یاد آ رہی ہے۔

برف جب گرتی ہے تو کوئی شور نہیں ہوتا۔ کوئی آواز نہیں ہوتی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر کوئی جل ترنگ نہیں بجتی ہے۔ برف تو بس چُپ چاپ گرتی ہے اُس جوان بیوہ کے آنسوؤں کی طرح جو اپنے نیم تاریک اور سرد کمرے میں اکیلی بیٹھی اپنے کمسن بیٹے کا سوگ منا رہی ہو۔ یا جیسے مٹی کے دیئے کی ٹمٹماتی روشنی میں کسی غریب کلرک کا لڑکا الجبرا کے سوال حل کر رہا ہو۔

درگا کی یاد بھی بس اسی طرح آتی ہے۔ کوئی دھڑکن تیز نہیں ہوتی۔ کوئی ہچکی فضا میں نہیں بکھر جاتی۔ کوئی ہنسی ہونٹوں کے دامن چاک نہیں کرتی یہ یاد چپکے سے آ کر دل کے شیش محل میں دھند کی طرح چھا جاتی ہے اور پھر یہ

سارا شیش محل بہار رچاندنی میں ڈوبا ہوا کوئی بھیانک طلسم بن جاتا ہے۔

دو دن سے۔ برف لگاتار گر رہی ہے۔ اور ایسے میں جی چاہتا ہے کہ آپ کو سامنے کاٹیج ؂ کے اس ڈرائنگ روم کی کہانی سناؤں جہاں کی ہر چیز بھڑکیلی کے ریشمی پردوں سے لے کر فرش پر بچھے ہوئے دبیز کشمیری قالین تک ہلکے گلابی رنگ کی ہے یہاں تک کہ تپائی پر رکھے ہوئے پیپر ماشی کے ٹیبل لیمپ کے تار بھی۔ اور جہاں کی نیم گرم فضاؤں میں "واٹ ۶۹" کی کیف آور مہک ہر دم پھیلی رہتی ہے۔

جب برف لگاتار گر رہی ہو اور "واٹ ۶۹" کی مہک اور فرانسیسی عطر کی خوشبو ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر گرم ہواؤں میں گھوم رہی ہوں اور کوئی لڑکی اطالوی حسینوں کی طرح خوبصورت ہو، اور پیانو پر "مورے جوبنا کا دیکھو بہار" بجا رہی ہو۔ اور کوئی شریف لڑکا پانچ سو پچپن کے سگریٹوں کا دھواں بکھیر رہا ہو۔ تو دوزخ کا ڈر اور جنت کی ہوس سب ہی کچھ بھول جایا کرتا ہے۔ بس! دوزخ کے اسی ڈر اور جنت کی اسی ہوس کی کہانی میں آپ کو سنانا چاہتا تھا۔ پر یہ کمبخت بڑگا کی یاد دھند کی طرح سارے ذہن پر چھا گئی ہے۔ اور اس دھند نے تمام چیزوں کے چہرے بگاڑ کے رکھ دیئے ہیں۔

اس دن حاجی اسمٰعیل جو کنٹریکٹر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، کہ ان مفلس اور قلاش لوگوں کی باتیں ذہن کو گندہ کر دیتی ہیں۔ ایک گندی مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔

ڈرگا اگر ایک ایسی لڑکی ہوتی جو کھڑکی کے سے چھپ چھپ کر دیکھتی ہوتی۔ اپنے محبوب کو اشارے کرتی ہے تو مجھے اس کی یاد کبھی اتنا بے چین نہیں کرتی اگر وہ ایک ایسی لڑکی ہوتی جو ٹوٹی پھوٹی زبان میں پریم پتر لکھتی ہے۔ اور پھر لکھ کر پھاڑ دیتی ہے۔ تب بھی مجھے کوئی احساس نہ ہوتا۔ اگر وہ کوئی ایسی لڑکی ہوتی جو برہ کے گیت گنگناتے گاتے کھڑکی کی سل پر ٹھوڑی رکھتے رکھتے سو جاتی ہے۔ تب بھی مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔

لیکن درگا ایک عجیب لڑکی تھی۔

وہ نہ آہیں بھرتی تھی۔ نہ پریم پتر لکھتی تھی۔ اور نہ کبھی گھر کے باہر پاؤں ہی رکھتی تھی وہ میرے ہی محلے میں رہتی تھی۔ اور میں نے کبھی اسے چھپ چھپ کر دریچے کی اوٹ سے کسی نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے نہیں پایا ہے۔ وہ کبھی گھر کا کام کاج کرتے وقت گنگنایا نہیں کرتی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے پٹ کبھی کسی مسکراہٹ کے بوجھ سے وا نہیں ہوئے تھے وہ جوانی کی حدوں کو بہت دیر ہوئی پھلانگ گئی تھی۔ اس کے سادے سراپا میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔ اس کے بال ہمیشہ الجھے الجھے اور بے ترتیب رہتے تھے۔ اس نے کبھی دنداسہ کے چھلکوں سے اپنے ہونٹ لال نہیں کئے تھے اس نے کبھی اپنی فراخ پیشانی پر بندیا نہیں لگائی تھی عجیب جذبات سے عاری اور متین سی لڑکی تھی وہ۔

میں تقریباً روز اسے میونسپلٹی کے نل پر دیکھتا تھا جب کہ وہ پانی بھر

بکھرا ہوا گھر۔ اٹھانے کی جد و جہد میں مصروف نہ ہوتی۔ اُس کے سنجیدہ چہرے سے اُس کے دکھی ہونے کا احساس ہوتا تھا اور نہ [illegible] ہی ہونے کا۔ وہ صرف ایک چہرہ تھا، جیسے کسی آرٹسٹ نے کاغذ پر چند ٹیڑھی سیدھی لکیریں کھینچی ہوں۔ اور اُن لکیروں میں جان ڈالنے سے پہلے ہی مر گیا ہو۔ اُس کا باپ شریدھر جو کسی مقامی دفتر میں چپراسی تھا۔ اِس لیے اُس کے گھر میں زندگی کبھی خوشحالی کی دھوپ نہ سینک سکی تھی۔ اُس نے کبھی اسکول کا منہ نہ دیکھا تھا۔ کبھی کسی سہیلی سے کوئی راز کی بات نہ کہی تھی۔ اُس کی کوئی سہیلی تھی بھی تو نہیں۔ شاید اُس نے اپنے بچپن میں کبھی گڑیوں کا بیاہ نہیں رچایا تھا۔ وہ تو بس ایک کتاب تھی۔ بند کتاب۔ جس کی جلد کھردری تھی اور جس کی حالت بہت گندی تھی اِس لیے آج تک کسی نے اِس کتاب کے ورق الٹ کر اسے پڑھنے اور اِس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

صرف ایک بار میں نے اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چند بوندیں لرزتی ہوئی دیکھی تھیں۔ یہ چار سال پہلے کی بات ہے۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ برف گھٹنوں گھٹنوں تک گر آئی تھی۔ اور پھر یہ برف جم گئی تھی۔ اِس لیے احتیاط سے قدم دھر کر چلنے والا آدمی بھی کبھی نہ کبھی پھسل ہی جاتا تھا۔ اور آس پاس کھڑے لوگوں کی بھرپور ہنسی کا مرکز بن جاتا تھا۔

وہ میونسپلٹی کے نل کے پاس پانی سے بھری ہوئی مٹکی کو کندھے پر جما رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے ایک قدم بڑھایا۔ پھر دوسرا قدم اٹھایا۔ اور جب تیسرا قدم بڑھانے لگی۔ تو دھڑام سے نیچے گر گئی۔ کم بخت

پھسلن ہی ایسی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا دینا چاہا۔ لیکن اس سے پہلے ہی وہ پھسل کر گر گئی۔ اور پھر افسردہ نگاہوں سے مٹکی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھنے لگی۔

"چوٹ تو نہیں لگی تیرے؟"

میں نے پوچھا۔

"نہیں میرے کوئی چوٹ نہیں لگی۔" اس نے نظریں نیچے کئے ہوئے ہی جواب دیا لیکن اس کی نگاہ میں کچھ کہتا سا تھا۔ کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے کچھ دیر پہلے مٹکی پانی سے بھری ہوئی تھی۔

"چوٹ تو لگی ہوگی۔ تب ہی تو تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں۔"

"نہیں۔ کہہ جو دیا۔ چوٹ نہیں لگی میرے۔"

اس نے ترچھی نظر کر جواب دیا۔ اور ٹوٹی ہوئی مٹکی کے ٹکڑوں کو جمع کرنے لگی۔ اور ایسا کرتے ہوئے نہ جانے کیا بڑبڑاتی رہی۔

ٹوٹ گئی مٹکی تو کون سا غضب ہو گیا۔ چار آنے نہیں تو زیادہ سے زیادہ چھ آنے میں نئی آ جائے گی۔ میں نے سوچا اور میں چل دیا۔ چوٹ تو اس کے واقعی لگی ہوگی۔ لیکن یہ مٹکی ٹوٹ جانے کی چوٹ غالباً زیادہ شدید تھی۔ کیونکہ جب مٹکی ٹوٹ جاتی ہے۔ تو پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ اور بیالیس روپئے

تنخواہ پانے والے ملازم کے لئے سمجھ آنے بڑی بات ہوتی ہے لیکن یہ خیال مجھے اس وقت نہیں آیا۔ جانے کیوں ؟

اُن دنوں میں سوچتا تھا کہ شریلا جی کو اب دُرگا کی شادی کرنی چاہئے کیونکہ دُرگا جوانی کے تپتے ریگستان میں بہت آگے بڑھ آئی تھی۔ یہ بات شاید شریلا جی جو بھی جانتا تھا۔ کیوں کہ کئی بار میں نے اُسے محلّے کے چند بزرگ آدمیوں کے ساتھ بات چیت کرتے سُنا تھا۔ اور پھر اس سلسلے میں پر وہ بہت بھی ہفتے میں ایک دو بار اُس کے گھر کے چکّر لگا دیتا تھا۔ ہاں دُرگا کی شادی ضرور ہونی چاہئے میں چاہتا تھا کہ دُرگا کے ہونٹوں پر ویسی مسکراہٹ دیکھوں جو نو بیاہتا لڑکیوں کے ہونٹوں پر شادی کے بعد کچھ دنوں کے لئے میکے آنے پر ملتی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ دُرگا کو تب دیکھوں جب اُس کے بال سنورے ہوئے ہوں جب اُس کی فراخ پیشانی پر کم کم کی بندیا چمک رہی ہو۔ جب اُس کے ہونٹ دنداسے کے چھلکوں سے لال ہوں جب اُس کی آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیریں ہوں۔ واقعی دُرگا اُس وقت حسین لگتی۔ نہ جانے میں کیوں اُسے حسین دیکھنا چاہتا تھا۔ انسانی فطرت بہت وسیع ہے مگر میں نے کبھی دُرگا کو حسین نہیں دیکھا۔ اب بھی جب وہ۔ مجھے یاد آتی ہے تو اُس کا وہ غمگین چہرہ اور جذبات سے عاری آنکھیں ہی میرے ذہن کے دریچے سے جھانکتی ہیں۔ یہ پار سال کے جاڑے کی بات ہے۔ کچھ دنوں سے برف لگاتار گر رہی تھی۔ اور شریلا جی کو مجبوراً اپنے افسر کے ساتھ دورے پر جانا پڑا تھا۔ اُس نے افسر کی بہت منت سماجت کی تھی۔ مگر اسے دورے پر جانے کے لئے مجبور

نہ کیا جائے۔ کیونکہ جاڑا ظالم شے ہے۔ لیکن افسر بھی مجبور تھا۔ دورے میں اُس کا کھانا کون پکاتا؟ صبح ہاتھ دھونے کے لیے پانی کون گرم کرتا دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد شام کو پاؤں کون دباتا۔ اس لیے افسر کی مجبوری کے پیشِ نظر شریدر جو کو اپنی مجبوری نظر انداز کرنا پڑی تھی۔ اور وہ دورے پر گیا ہوا تھا۔

ایک رات جب کہ میں سونے کی تیاری کر رہا تھا، ایک آتش فشاں پھٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے میں مبہوت رہ گیا۔ اور پھر رونے پیٹنے اور شور مچانے کی آوازیں میرے کانوں کے پردوں کے ساتھ ٹکرانے لگیں۔

آتش فشاں نہیں پھٹا تھا۔ بلکہ شریدر جو کے پرانے، شکستہ، بوسیدہ مکان کی چھت اچانک گر پڑی تھی۔ محلے میں ایک کہرام مچ گیا۔ شریدر جو کی بیوی شوبھاوتی اپنے بال نوچنے لگی۔ ننھے بچے رونے چلانے لگے۔ اور درگا؟ وہ ایک کونے میں اُس بلی کی طرح سہمی سہمی بیٹھی تھی۔ جس نے ابھی ابھی کسی بھیانک کتے کا غراتا ہوا چہرہ دیکھ لیا ہو۔ ایک چھوٹی سی ٹنگی ٹوٹ جانے پر رو دینے والی لڑکی درگا اپنے مکان کی چھت گر جانے پر ٹکر ٹکر لوگوں کی طرف دیکھتی تھی۔ اور اُس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا۔ عجیب لڑکی تھی وہ۔

دوسرے دن سویرے میں پھر شریدر جو کے مکان پر گیا۔ اور اُس کی بیوی کو سمجھانے لگا۔ کہ اس وقت اُن کا اس مکان میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ ٹوٹی ہوئی چھت کا سارا ملبہ پڑا ہے۔ وہ سمجھتا ہے دوسری منزل کی

شہتیریں بھی ٹوٹ جائیں

"پھر کیا کریں؟ وہ یہاں ہوتے تو ——"

شوبھاوتی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دیپ مالائیں دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ اور اسی پریشانی کے عالم میں میرے منھ سے جھٹ نکل گیا۔

"آپ لوگ ہمارے مکان میں آ جائیے۔ وہاں کافی جگہ ہے۔"

"نہیں ماں! پتاجی جب تک نہ آئیں گے ہم کیسے جا سکتے ہیں؟"

دور کونے میں کھڑی ننھی درگا نے کہا۔

میں نے ایکبار گہری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ حسبِ معمول کسی طرح کے جذبات سے عاری تھا۔ ارے! یہ جھوٹی تمکنت! یہ لوگ اگر پیار دھن کے بھوکے ہوتے ہیں۔ تو باہر کسی کو اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ کتنی ظالم تمنائیں ہوتی ہیں جو ان لوگوں کے دروازوں کے پیچھے قضا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں کتنی ناکام آرزوؤں کی لاشیں ان لوگوں کے بند دلوں میں پڑی پڑی سڑتی ہیں۔ اور آنگن کا منھ نہیں دیکھتیں۔ درگا نے جو اپنے اردگرد ٹاٹ کی دیواریں کھڑی کی تھیں۔ وہ ہمارے مکان میں آنے سے کیسے کھڑی رہتیں؟ اُس کی مفلس جوانی کے سارے گھاؤ جنھیں اُس نے اب تک چھپائے رکھا تھا۔ ایسا کیسے چھپ سکتے تھے؟

مجھے غصہ آ گیا۔

"عجیب لڑکی ہو تم۔ اپنی معمولی ضد کے لئے تم چار جانوں کا کچھ بھی خیال نہیں کرتیں؟"

اُس نے میری طرف ایک تیز ابی نگاہ پھینک دی۔ اور جھٹ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسی دن وہ لوگ ہمارے ہاں چلے آئے اور پھر تیرہ مہینوں تک ہمارے مکان میں رہے۔

ان تیرہ مہینوں میں درگا نے کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ ان تیرہ مہینوں میں میں نے کبھی درگا کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی کبھی اُس کے ہونٹوں پر ہنسی کے سائے تھرتھراتے نہیں دیکھے۔ اور میں ایک بار پھر شدت سے چاہنے لگا کہ درگا کی شادی ہو جائے۔

لیکن درگا کی شادی نہیں ہوئی۔

•

ان تیرہ مہینوں میں شرید رجو نے پیسے جمع کرنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ میں تقریباً روز درگا کو اپنے اور اپنے بھائیوں کے پھٹے ہوئے کپڑے رفو کرتے دیکھتا تھا۔ شرید رجو کو تو خیر دفتر سے وردی مل ہی جاتی تھی۔ لیکن اُس کی وردی سے شو بھاوتی کا پھٹا ہوا قرن ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔ درگا کی تار تار شلوار رفو نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ چیزیں تو روپیہ پیسہ خرچ کرنے کے بعد ہی آتی ہیں پر پچالیس روپے میں آدمی کتنا خرچ کر سکتا ہے۔ اور مکان کی ٹوٹی ہوئی چھت مرمت کرنے کے لئے بچت کتنی کر سکتا ہے؟ شاید شرید رجو آپ کے اس سوال کا جواب بتا دے یا شاید درگا بتا دے جو ایک وقت کھانا کھانے کے باعث ہڈیوں کا پنجر بن گئی تھی۔

تقریباً روز ہی شریدر جو اپنے ٹوٹے ہوئے مکان کو دیکھنے جاتا تھا۔ اور پہروں وہیں بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا کرتا رہتا تھا۔ اگر سوجی ہوئی آنکھیں یہ ظاہر کرتی ہیں۔ کچھ سوچتا رہتا تھا۔ تو اُس کی آنکھیں بہت سوجی ہوئی تھیں۔ ایک دن اُس کی سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔

"شریدر جو! کیوں بچے بنتے ہو۔ تمہارے آنسوؤں سے شہتیر تو نہیں بن سکتے جن سے تمہارے مکان کی چھت ٹھیک ہو گی۔ ہمت سے کام لو!"

"تو کیا آپ سمجھتے ہیں میں نے آج تک ہمت سے کام نہیں لیا؟ ہمت ہی کے سہارے تو زندہ ہوں۔ پر ہمت بھی جواب دے دے تو آدمی کیا کرے؟"

"ہاں، کیا کرے!"

شریدر جو کے مکان کی چھت ٹھیک نہیں ہو سکی کیونکہ جب تیرہ مہینے کے بعد اُس کے تبادلے کا حکم آیا تو اُس نے اپنی جمع کی ہوئی پونجی کو گن کے دیکھا کُل ایک سو اکیس روپے اور باسٹھ نئے پیسے تھے۔ اس میں ایک سو روپے پہلے کی پونجی تھی۔ اور اکیس روپے باسٹھ نئے پیسے اس کی تیرہ مہینوں کی خانہ کشی کی پیداوار! جاتے ہوئے اُس نے مجھ سے رخصت چاہی اور گلوگیر آواز میں کہا۔

"مکان کی مرمت بھی نہیں ہو سکی۔ درگا کی شادی بھی نہیں ہو گی۔ اب کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ نہیں ہو گا!"

میں نے [illegible] آخری بار درگا سے کہنا چاہا تھا۔ — سن درگا! تیری

شادی نہیں ہو سکتی۔ تیرے باپ کے مکان کی چھت ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ تیرے باپ کی تنخواہ کل بیالیس روپے ہے جو وہ سرکار کے خزانے سے وصول کرتا ہے اس لئے اٹھ اور اٹھ کے بال سنوار۔ آنکھوں میں کاجل کی لکیریں کھینچ۔ ماتھے پر کم کم کی بندیا سجا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی دھوپ سجائے سیٹھ جیون شاہ کے مندر کی دیو داسی بن جا۔ اور بھگوان کی خوبصورت مورتی کے سامنے جسے جیون شاہ نے گیارہ ہزار روپے میں خریدا ہے۔ ناچتے ناچتے بے دم ہو جا۔ ممکن ہے کبھی کسی پجاری کی نظر تمہارے جسم پر پڑے اور تمہیں آکاش پر لے جانے والا رتھ ملے اور وہ تمہیں اس رتھ پر سوار کر کے اندر لوک کی سیر کرائے۔ خبردار! جو تم نے ہاں نہ کی صورت بنائی یا پریم کے گیت گائے۔ کیونکہ اس صورت میں تمہیں مندر سے دھتکار کر نکال دیا جائے گا۔ اور کوئی موٹی توند والا مہنت لمبا سا جنیو پہنے، اور ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگائے اپنی بھدی آواز میں کہے گا۔

"نکال دو اسے۔ سارا مندر اپوتر کر دیا کلموہی نے۔"

اور اس وقت بھگوان تمہاری کوئی سہایتا نہیں کریں گے۔ کیوں کہ بھگوان کا سارا کاروبار مہنت ہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

مگر ——

مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

کیونکہ بشرمادیرچہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ شوبھا رانی کی آنکھیں نمناک سی تھیں۔ بچوں کی نگاہیں نیچی تھیں۔ پرندرگا کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں

جھلملا رہا تھا۔

لمحے بیت گئے ـــــ

دن بیت گئے۔ ـــــ

اور رفتہ رفتہ میں سمجھنے لگا کہ کوئی ڈرگا تھی جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر، ایسی باتوں پر جو دل پر یا جیب پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتیں، آنسو بہاتی تھی۔ اور بڑی بڑی باتوں پر، ایسی باتوں پر جن کا حل سوچتے سوچتے دماغ چکرا جائے اور کچھ نہ بن پڑے، خاموش ٹکر ٹکر دیکھتی رہتی تھی۔ کوئی ڈرگا تھی جس میں نہ کوئی دلکشی تھی سوائے اس کے کہ وہ جوان تھی۔ کوئی ڈرگا تھی جو عام لڑکیوں سے ہٹ کر، اپنی ایک الگ دنیا کی مالک تھی۔ میں بھول گیا۔

شریدر جو کے جانے کے کوئی ایک سال بعد، میں ایک دن کولگام کسی کام کے لئے گیا۔ شریدر جو تحصیلدار کے کمرے کے باہر زور زور سے آوازیں دے رہا تھا۔

"مسماۃ زونی وغیرہ ـــــ زونی وغیرہ ـــــ"

میں نے اُسے پہچانا نہیں۔ بہت کمزور سا معلوم ہو رہا تھا۔ اور بوڑھا بھی لیکن اُس نے مجھے جھٹ پہچان لیا۔

"ارے آپ یہاں کیسے؟ گھر میں سب خیریت تو ہے؟ بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی۔"

اُس نے ایک ہی سانس میں کہا۔

"ارے شریدر جو تم؟" میں اُس کی بدلی ہوئی حالت دیکھ کر پسیج گیا نہ اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان کو ابھی تک نہیں بھولا تھا جسے اُس نے میرے بھرنے سے پہ چھپڑ دیا تھا

"وہ میرا مکان ابھی ہے یا گر گیا سب کا سب؟ فرصت ہی نہیں ملتی ورنہ دیکھنے ضرور چلا آتا۔"

"ابھی تک تو ٹھیک ہے شریدر جو! تم سناؤ۔ بال بچے کیسے ہیں؟ درگا کی بات کہیں پکی ہو گئی؟"

مجھے درگا جھٹ سے یاد آگئی۔ نہ جانے ذہن کے کس حصے پر چھپ کر بیٹھی تھی۔ شریدر جو کے سارے بدن میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر چونکا دینے والی ہلکی آواز سے کہا۔

"جب مکان کی چھت کی مرمت نہیں ہوئی۔ تو اُس کا بیاہ کیسے ہوتا؟"

"چھت کی مرمت تو خیر ہوتی رہے گی جب تک درگا کی بات تو کہیں پکی کر دیتے۔"

"ایسا کیا چھپاؤں بھیا! اصل میں درگا کی شادی جبھی ہو سکتی تھی جب مکان کی چھت کی مرمت ہو جاتی۔ کیوں کہ جہیز کے بدلے اس مکان کا لالچ ہی کسی کو پھنسا سکتا تھا۔ پر اب مکان نہ رہا۔"

شریدر جو کا گلا رندھ گیا۔

دل میلا نہ کرو شریدر جو۔ کوئی نہ کوئی بھلا گھرانا ڈھونڈ ہی جائے گا۔"
میں نے ڈھارس بندھانے کے لئے کہہ دیا۔

"وہ ڈھونڈ ہی گیا بھیّا! فرق صرف اتنا ہوا کہ کوئی برات دروازے پر آکر نہیں رکی۔ کوئی ڈولی نہیں اٹھی۔ کوئی آنسو نہیں گرا۔"

"میں ــــ میں نہیں سمجھا شریدر جو!"

شریدر جو نے میری طرف بھرپور نظر سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں یکایک آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اس کا نچلا ہونٹ تھرتھرانے لگا۔

"درگا بھاگ گئی آج تین مہینے ہو گئے۔"

"نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، درگا ایسی لڑکی نہیں۔ تم سٹھیا گئے ہو شریدر جو! اس نے کبھی گھر سے باہر پاؤں نہیں رکھا۔ میں بولنا چاہتا تھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ ایسے موقعہ پر کیا کہنا چاہئے۔ میں صرف پاگلوں کی طرح شریدر جو کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

وہ بھرائی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہی کیا بے چاری نے۔ ورنہ اس کے کنوارے پن کے زہر سے کبھی میرا دماغ چل دیتا۔ اور میں کسی رات اس کا گلا گھونٹ کر اسے موت کی وادیوں میں دھکیل دیتا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو شریدر جو! تمہارے چہرے پر درگا کے خلاف غصے کی سیاہی کیوں نہیں؟ تم اسے تلاش کر کے اس کا خون کر دینے کی بات کیوں نہیں کرتے؟

اُف ! یہ میری زبان کیوں یک لخت بند ہو گئی ؟ تم اپنے ناخنوں سے میرا چہرہ کیوں لہولہان نہیں کر دیتے شرمیلا رجو ؟ کہیں اس عظیم سانحے سے تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو ؟"

"مجھے کوئی افسوس نہیں۔ کوئی دکھ نہیں۔ صرف حیرت اس بات کی ہے۔ کہ جس لڑکے کے ساتھ وہ گئی ہے اُس کے گھر میں نے ایک مہینہ پہلے ہی پیغام بھجوا دیا تھا اور انھوں نے انکار کر دیا تھا"

"بس کرو شرمیلا رجو! اب تم کچھ مت کہو۔ کیوں کہ جب درگا جیسی لڑکی بھاگ جاتی ہے۔ تو کہیں نہ کہیں ضرور کوئی خرابی ہوتی ہے میرے سامنے درگا سے متعلق تمام باتیں ایک ایک کر کے گزر رہی ہیں وہ اُس کا متین اور جذبات سے عاری چہرہ وہ اُس کے اُلجھے اُلجھے بال اور گمبھیر سراپا۔ وہ اُس کی خاموشی اور ضبط کرنے کی بے پناہ قوت !"

کہاں ہو تم اسمٰعیل جوگیندر پکیر ؟

آؤ اور دیکھو کہ تم جس گندی مچھلی کی بات کر رہے تھے، وہ کتنی صاف اور اُجلی اُجلی ہے۔ اور تم جس تالاب کی بات کر رہے تھے۔ وہ کتنا گندہ اور تعفن زدہ ہے۔ بلاؤ اپنے قبیلوں کو، اور اس تالاب کی ساری گندگی اور کثافت، دور کراؤ۔ اس سے پہلے کہ یہ دلدل تمہاری ٹانگیں جکڑ لے اس سے پہلے کہ یہ کثافت عورت کی کوکھ تک پہنچ جائے اور ساری نسل، ساری انسانیت کا چہرہ کوڑھ کے پیپ میں ڈوب جائے !

"درگا مجھے بہت یاد آتی ہے بھیا ! میری بچی !!"

شریدر جُو کی آنکھیں ایک جھرنے کی طرح بہہ نکلیں۔
اور آنسو کا ایک دریا میری جانب بڑھنے لگا۔

"درگا مجھے بھی بہت یاد آتی ہے شریدر جُو! کیوں کہ میں نے اُس کی خاموشی اور اُس کے ضبط کے ساتھ پیار کیا تھا ــــــــ!"
میرے مُنھ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

پرایا آنگن

میرے آنگن میں یاسمن کی جھاڑی پر دیر سے ایک چڑیا بیٹھی چہچہا رہی ہے مٹیالے پروں والی، سُبک خرام، نازک سی چلبلی سی چڑیا۔ بالکل تم جیسی۔ کہیں تم ہی سچ مچ چڑیا بن کر میرے آنگن میں تو نہیں آئی ہو؟

مت چہچہاؤ ننھی سی جان! یہ اندر کا بیمار ابھی ابھی سو گیا ہے۔ اسے سونے دے، سونے دے، سونے دے۔

میرے کمرے میں تپائی پر وہ رنگین تصویر ایک خوبصورت فریم میں پڑی ہے جس کا پرنٹ تمہارے لیے بمبئی سے بنا کر آیا تھا۔ اور جسے تم نے نہ جانے کس لمحے سے متاثر ہو کر مجھے بخش دیا تھا۔ اس تصویر میں ایک خوبصورت لڑکی چپل کے تسمے ٹھیک لگاتے مسکرا رہی ہے۔ بالوں کی چند پریشان لٹیں چہرے پر جھک آئی ہیں۔ تمہارا ہاتھ تمہارے ٹورسٹ گائیڈ کے شانے

پر کچھ مسمار رہا ہے لیکن میں اس تصویر کا ذکر کیوں کر رہا ہوں۔ اب تو ہر تصویر تمہاری تصویر نظر آتی ہے ہر نقش تمہارے خد و خال ابھارتا ہے۔ ہر قدم تمہاری منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔ تم نے ایک تصویر بنا کر شاید اپنا حق ادا کیا۔ میرے پاس بھی چند تصویریں ہیں جن میں تم ہی تم نظر آتی ہو میرے وجود کی پرچھائیاں تک نہیں ہیں۔ دیکھو گی ان تصویروں کو؟ شاید تمہیں میرے وجود کا کوئی بھولا بسرا نشان نظر آئے

یہ ٹنگمرگ ہے۔

چیل کے چھتناروں سے ہوا ہوے ہوے گنگنا رہی ہے۔ سورج ابھی ابھی بادل کے ایک ٹکڑے کی اوٹ میں چھپ گیا ہے۔

"میم صاحب پونی؟ ایک دم اچھا والا" ایک مسکین صورت دیہاتی کہہ رہا ہے اور تم اپنے خوبصورت بالوں کو جھٹک کر اپنے پپا کی طرف دیکھ رہی ہو۔ اور تمہارا پپا پونی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اور میں تمہاری کار میں بیٹھا تم دونوں کی طرف دیکھ رہا ہوں۔

دیکھ رہا ہوں کہ تم متوالی نگاہوں سے ان چیل کے درختوں کی طرف دیکھ رہی ہو۔ اس دور تک پھیلی ہوئی گھاٹی کو دیکھ رہی ہو۔ ان چمکیلے جسموں والے گھوڑوں کو دیکھ رہی ہو اور ان تمام چیزوں سے متعلق ایک ایک بات اپنے دل میں اتار رہی ہو۔ لیکن میرے لئے ان میں کوئی کشش نہیں ہے۔ یہ میری جانی پہچانی چیزیں ہیں۔ میں نے انہیں نہ جانے کتنی بار دیکھا ہے۔ میری زندگی یہی ہے۔ آج تم لوگوں کے ساتھ۔ کل کسی اور

دوسری پارٹی کے ساتھ۔ یہاں تنا بھانت کے لوگ، طرح طرح کے چہرے، قسم قسم کی بولیاں۔ پہلگام سے چندن واڑی تک، اہربل سے یوسمرگ میدان تک۔ اچھہ بل سے اننت پورہ تک۔ سنہ مرگ سے کھلن مرگ تک، بقول تمہارے یہ پورڈ رسٹا گائیڈ اب ان چہروں کو دیکھ دیکھ کر تھک سا گیا ہے۔ ہوا سے تمہارے بال لہرا رہے ہیں۔ تمہارا پپا اگلے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اب اس پگڈنڈی پر صرف ہم دونوں کے گھوڑے جا رہے ہیں۔ پگڈنڈی کے ارد گرد چاروں طرف چیل اور دیودار کے گھنے جنگل ہیں۔ میں اور تم ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ قدم بہ قدم تمہارے منھ سے خوشی کے مارے ننھی ننھی چیخیں نکل رہی ہیں۔

"تمہارا پپا بڑا اگلی ہے :"

"جی ہاں! میری ہی طرح !!"

"نانی۔ تم اگلی تھوڑا ہے۔ تمہارا گرل فرینڈ سے پوچھو۔ تم ہینڈسم ہے کہ نہیں"

"میرا کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے :"

"گڈ، تم کیتا جھوٹا بولتا ہے :"

"جی نہیں، سچ کہہ رہا ہوں۔"

"ہم تمہارا فرینڈ نہیں ہے کیا ؟"

تمہارا گھوڑا تھوڑی بڑھا کر میرے گھوڑے کے کان کو سونگھ رہا ہے گھوڑا آگے بڑھاؤ نسیم صاحب۔ ورنہ یہ بک جائے گا۔ اور تمہیں کسی کہانی میں

گزرے دنوں کا —— :

یہ پہلگام کی تصویر ہے :

تم لدر کے کنارے بیٹھے ہیں۔ لدر کے پُر شور کنارے، جس کا پانی زخمی شیر کی طرح دہاڑتا چنگھاڑتا جھاگ بناتا لپکتا چلا آرہا ہے۔ ایک مسلسل شور گھاٹی کے اِس کنارے سے اُس کنارے تک پھیلا ہوا ہے موسم بھیگا بھیگا ہے اور تمہارا پیا کلر پاس ہی کسی پتھر پہ چلا گیا ہے۔ تم بے خیالی میں پانی کے بیچ پڑے ہوئے ایک بڑے سے گول پتھر کو ٹھوکریں مار رہی ہو۔

"تم کسی سے محبت کرتا ہے ؟"

"طبیعت اِس طرف آتی ہی نہیں "

"کیسے نہیں آتی ؟"

"بس نہیں آتی :"

"اچھا یہ بولو، کوئی تم سے محبت کرتا ہے کہ نہیں ؟"

"کوئی نہیں کرتا۔"

"کیسے نہیں کرتا ؟ تمہارا کوئی گرل فرینڈ نہیں ؟"

"نہیں، ایک بار کہہ تو دیا ہے کہ ہمارے یہاں گرل فرینڈ نہیں ہوتے شادی کے بعد ایک بیوی ہوتی ہے اور بس —— "

تم سر کو جھٹک کر بالوں کی ایک پریشان لٹ کو کندھے کے پیچھے پھینک رہی ہو۔ میں تمہارے تنفس کا اتار چڑھاؤ محسوس کر رہا ہوں۔ لدر کے تیز رو پانی کا مسلسل شور میرے اور تمہارے کانوں میں گونج رہا ہے۔ وہ دور بادل کا ایک

ٹکڑا سورج کے چہرے پر نقاب ڈالنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ لدر کے اُس پار کوئی چرواہا اپنے ریوڑ ہانک رہا ہے اور اچانک بے خودی میں تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ کی انگلیاں ٹٹولنے لگا ہے۔ اپنے ہاتھ کو روک لو۔ اپنے جذبوں کو سنبھالو اپنی خوشبو کو مست بکھرتی ان فضاؤں میں اپنے سینے کا زیر و بم چھپاؤ میری نظروں سے۔ ابھی تمہارا پیا وسکی کے نشے میں دھت جھومتا جھامتا آجائے گا اور ایک غریب ٹورسٹ گائڈ کی نوکری خطرے میں پڑ جائے گی

"آؤ ہم فرینڈس ہو جائیں!"

تمہارا ہاتھ اسی طرح میرے ہاتھ کو سہلا رہا ہے۔ میں کچھ نہیں سمجھ رہا ہوں، ایک اذیت ناک لمحہ گزر رہا ہے بادل کا وہ ٹکڑا سورج کے چہرے پر نقاب ڈالنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

"آؤ پلیس تم ہم کو بور کرتا ہے"

یہ تصویر پر لڑکی ہے۔

حدِ نگاہ تک پانی ہی پانی ہے۔ ایک دم چڑیا لدر کے پانی میں غوطہ لگا گئی۔

"ارے ڈوب گئی بے چاری!" تم چیخ رہی ہو۔

"یہ نہیں ڈوبتی"

"کیسے نہیں ڈوبتی بے چاری ڈوب ہی تو گئی"

"یہ مچھلی تلاش کرتی ہے اسے غوطہ لگانے کی عادت ہے!"

"تمہیں کسی چیز کی عادت نہیں ہے ؟"

"یہ تم گھوم پھر کے بات میرے اوپر کیوں لے آتی ہو ؟ تم میرے بارے میں مت سوچو میم صاحب! وہ ڈل کی لہریں دیکھو۔ جیسے دل کی جھیل میں جوار بھاٹا آیا ہو۔ یہ دوسری کے درخت دیکھو۔ قطار اندر قطار جیسے کسی مجنوں نے دل کے نہاں خانے میں ارمان سجائے ہوں۔ اور اودی اودی گھٹاؤں کے بیچ وہ چاند دیکھو جیسے کسی کی زلف ناشکن در شکن پریشان ہو گئی ہو۔ وہ ایک ناؤ لہروں پہ ڈول رہی ہے۔ وہ ایک چیل ہواؤں کے دوش پر تیر رہی ہے۔ وہ ایک مرغابی پانی کی سطح پر گردن اونچی کر کے اپنے ساتھی کو ڈھونڈھ رہی ہے۔ تم میری طرف مت دیکھو تم مناظر دیکھنے آئی ہو۔ چہرے تو تمہیں بمبئی میں بھی نظر آئیں گے۔"

"اے!"

"کیا ہے ؟"

"تم کیسا ٹورسٹ گائیڈ ہے۔ تم ہمیں اس جھیل کا جل پری کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہتا ہے"

"اس جھیل میں کوئی جل پری نہیں رہتی۔ ایک ڈل کا دیوتا رہتا ہے۔"

انڈرسن:

"تم کو جل پری اچھا لگتا ہے نا؟"

"میں نے تو کبھی کوئی جل پری نہیں دیکھی ہے۔ دیکھوں تو بتا دوں!"

"تو دکھاؤں ؟"

تکیے ؟"

"یس ! پانی میں اُتر کے ۔"

"نہ جانے تم کن رمزوں کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ کن کنایوں سے کام لیتی ہو۔ میں کبھی تمہارے اشارے سمجھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرا ہاتھ بہت چھوٹا ہے اور تمہارا گریبان بہت اونچا۔ اگر میں جست لگا کے تمہارے گریبان کو پکڑ لوں بھی تو تمہارا گریبان پھٹ جائے گا۔ اور میں ایسا کروں گا کہ پھر کبھی نہ اٹھ سکوں۔ اپنے اس پور ڈرسٹ اگاؤنڈ پہ رحم کرو میم صاحب۔ کسی خیال میں بہہ گیا۔ تو عمر بھر کنارہ نہ پا سکے گا۔ کسی تصور میں کھو گیا۔ تو ابد تک کھویا ہی رہے گا......

اس تصویر میں یہ بوڑھا چنار دیکھ رہی ہو نا؟ یہ وہی چنار ہے جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں تم نے اپنے بال کھول دئے تھے۔ اور ایک گھٹا لہرا کے رہ گئی تھی۔ یہ گھٹا آج بھی میرے ذہن میں لہرا رہی ہے۔ اور سچ مانو تو بادل تمہارے چھنٹے ہی نہیں، جدائی کی ایک کالی لمبی بھیانک رات کی طرح یہ میرے سارے وجود پر چھا گئے ہیں۔ تم چنار کے تنے سے ٹیک لگائے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کھرچ رہی ہو۔ تمہارے بال سرخ ربن میں بندھے ہوئے تمہارے شانے پر ڈھلک آئے ہیں۔ ان کا ایک سرا زمین کو چھو رہا ہے۔

"اے مسٹر! یہ تم ایک ٹک سے ہماری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں، ایسے ہی۔"

"اے کم آن! بولو کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں بس ویسے ہی دیکھ رہا تھا۔"

"گوڈ ! تم کتنا جھوٹ بولتے ہو۔ تم کو ہماری قسم سچ سچ بولنا !"

"تمہارے بال دیکھ رہا تھا۔ بہت اچھے ہیں۔"

"تم بڑا نانٹی ہے۔ کھول کے دکھاؤں ؟ ہم کو بھی اچھا لگتا ہے۔"

تم نے بال کھول دئے۔ خوشبو کی ایک لہر اٹھی، تڑپی اور سب پھیل گئی اور پیڑ سے چنار کے پتے تھرتھرائے۔

میں چاہ رہا ہوں کہ ان بالوں کو چھو کر دیکھوں۔ ایک انگلی پر لٹ میں سے کسی لٹ کو لپیٹے لپیٹے سو جاؤں کسی کے زانو پر سر رکھ کے۔ لیکن میں اس خواہش کو دل ہی دل میں تھپک تھپک کر سلا رہا ہوں۔

آج یہ خواہش جاگ اٹھی ہے۔ تم تو بہت دور چلی گئی ہو اور اتنی بڑی ہو گئی ہے یہ خواہش کہ لوری سنانے سے بھی نہیں سوتی۔ تھپک تھپک کر بھی نہیں سوتی۔ سو جا ری ننھی سی خواہش کی دنیا سو جا۔

بارش کے قطرے ٹپ ٹپ بنگلے کی چھت پر گر رہے ہیں۔ کھڑکی کے شیشے سے اس حمام کے کھنڈر نظر آ رہے ہیں۔ جو کسی زمانے میں چراغ کی لو سے گرم کیا جاتا تھا۔ اور جس میں کوئی بادشاہ گرم پانی کے فوارے کے نیچے بیٹھ کر آنکھیں نیم وا کئے سنطور کے نغموں سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ لیکن یہ تاریخ کی باتیں ہیں جس طرح اچھہ بل کے ڈاک بنگلہ کی یہ تصویر تاریخی چیز بن کر رہ گئی ہے اس تصویر میں بھی تم ہی تم ہو۔ یا یہ شاید میری اپنی نظر کا دھوکا ہے۔ میں کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا بارش کے قطرے گن رہا ہوں۔ تم دوسرے

کمرے میں اپنے پپا کے ساتھ رمی کھیل رہی ہو۔ جھمکے جھمکے بادلوں میں بجلیاں تڑپ رہی ہیں۔ برآمدے میں ایک گجراتی نوجوان اپنی نئی نویلی دلہن کے پاؤں میں پھول لگا رہا ہے۔

"تمہاری سوچوں کے لئے دس سنٹ چاہیے"

"سوچیں بکاؤ نہیں ہوتیں۔"

"پھر بتاؤ کیا سوچ رہے تھے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ بارش دیکھ رہا تھا۔"

"گوڈ! تم کیسا بدھو آدمی ہے تم ہمارے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔"

"تمہارے بارے میں، میں کیوں سوچتا بھلا؟"

"نہ نوں! میں پپا کے ساتھ رمی کھیل رہا تھا نا، تو صرف تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک بھی پوائنٹ نہیں جیتا۔"

"تم میرے بارے میں کیا سوچ رہی تھیں؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ مجھے تمہارے ساتھ موہ ہو گیا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"کیوں؟ کوئی گالی دیا میں نے؟"

ہائے میں تم کو کیسے بتاؤں ایم صاحب کہ تم نے مجھے کتنی بڑی گالی دی ہے۔ آج میں اس گالی کی تلخی کو اپنے بہت اندر محسوس کر کے [illegible] جینے، زندگی کے یا عشق پہچان کی تلیں یا [illegible] مجھے [illegible] ہیں۔

چنبیلیاں ان میں سے یہ تھی ایک پھول کاٹ کر میرے ہاتھ میں تھما رہی ہو۔
"یہ پھول میرے بالوں میں لگا دو گے؟"
"یہ تم کو آج کیا ہو گیا ہے تم جاکر اپنے پاپا کے ساتھ رمی کیوں نہیں کھیلتی"
"پاپا بےچارے تو سو گئے۔ یہ پھول لگا دو نا میرے بالوں میں۔"

میں تمہارے بالوں میں پھول لگا رہا ہوں۔ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں میرے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر رہی ہیں۔ اور اچانک سے خبر تھا میں تمہاری باہیں میرے گلے میں جھول گئی ہیں قینچی کے ایک لمس سے یہ کلی بے دردی سے چھپ کے سے یہ کاٹ دی ہے۔ قفس کی تیلیاں چاروں طرف پھیل گئیں۔ باہر بادل زور سے گرج رہے ہیں بجلیاں چمک رہی ہیں، اور کھڑکی کے اندر آ رہی ہیں عشق پیچاں کی بیلیں بارش کی پھوار میں اسی طرح تمہاری بھی کاش یہ بارش کمرے کے اندر گھس آئے۔ جانے کمرے میں ہوا۔ اس قدر بوجھل کیوں ہے۔ جانے کمرے کی دیواریں اس قدر کیوں تپ رہی ہیں ہر شے بخار کی غنودگی میں کھو گئی ہے ایک سرد ہوا کا جھونکا اس کمرے کے اندر بھی بھیجو میرے معبود! میں نے یہ لمحہ تم سے کبھی نہیں مانگا تھا کبھی نہیں!!

اچانک عشق پیچاں کی کلی نے ہونٹ کھولے جیسے خوشبو پھیلنے لگی پھیلتی رہی۔ بے چاری کلی! کوئی اُسے کیوں کر سمجھائے کہ اس خوشبو کے اندر کونسی موت پنہاں ہے؟

تمہاری انگلیوں میں اس رات کونسی موت پنہاں نہیں تھی۔ جب وہ میرے بازو میں کھب گئی تھیں کھب گئی تھیں۔ تمہارا چہرہ تو موت کا چہرہ

نہیں تھا پھر یہ میرے دل میں قبر کا بھاری پتھر کس کی لاش کو ڈھک رہا ہے
کاش اس لاش کی کوئی تصویر میرے پاس ہوتی۔

دامودر ایئرپورٹ کے ویٹنگ روم میں تم اور میں، دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھے ہیں۔ تم نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا لیا ہے میری آنکھیں حیران حیران چاروں طرف دیکھ رہی ہیں۔ پر اصل میں کسی طرف بھی نہیں دیکھ رہی ہیں۔ تمہارے پیا باہر کسی آدمی کے ساتھ بات کرنے میں مشغول ہیں —

"ششی! خط لکھو گی نا؟"

"ہوں!"

"کبھی مجھے یاد کرو گی؟"

"ہاں جب کشمیر کی یاد آئے گی۔ تو تم ضرور یاد آؤ گے۔"

"ورنہ نہیں!"

"بمبئی میں ہم لوگ بڑا بزی رہتا ہے!"

"مگر تم کو میرے ساتھ پیار ہو گیا ہے۔ ہے نا؟"

"پسنجر جہاز کی طرف جانے لگے ہیں چلو!"

"لیکن ششی! میں اس محبت کا کیا کروں جو تم نے ڈھیرے ڈھیرے میرے دل میں جگائی ہے!"

"فارگٹ اٹ! تم میرے بہت اچھے دوست ہو کشمیر میں تمہارے ساتھ بہت اچھا ٹائم پاس ہوا۔ چلو پیا تو جہاز میں داخل بھی ہو گئے۔"

میری آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔

جہاز ہوا میں ناچ رہا ہے۔

دھند کوئی تتلی کھڑا آنکھیں پونچھ رہا ہے رو رہا ہے بے چارہ!

"اے کم آن! جذباتی مت بنو۔ دیکھو یہ بیگ اٹھاؤ جہاز میں سیٹ لوگ بیٹھ گیا ہے اچھا بابا ہم تم کو خط بھی لکھیں گے۔ تمہیں یاد بھی کریں گے۔ اب تو آؤ!"

دھند کوئی جھنڈی ہل رہی ہے۔

کوئی سیٹی بج رہی ہے۔

مسلسل بجتی جارہی ہے۔

کوئی چیخ رہا ہے

ہنسی کا ایک چھناکا بکھر گیا ہے ــــــ!

مت چیخو، ننھی سی جان! یہ اندر کا بیمار ابھی ابھی سو گیا ہے۔ اسے سونے دے! سونے دے!! سونے دے!!!

میرا گاؤں

تھوہڑ کی خاردار جھاڑیوں کے اس پار ایک نالہ ہے اور نالہ کے اس پار
میرا گاؤں ہے۔ اس نالے میں برسات کے دنوں میں پانی آتا ہے۔ اور برسات
سے پہلے یہ ایک گول پتھروں سے بھری ہوئی خندق دکھائی دیتا ہے ــــ
تھوہڑ کی جھاڑیوں کے اس پار زہریلے قسم کے سانپ پلتے ہیں
لوگو! مجھے اٹھا کر پٹاخے کی طرح کسی پتھر کے چہرے پر دے مارو۔ میرے
گاؤں کی آستین میں سانپ پلا کرتے ہیں ــــ ادھر لکھی رام درزی اپنی پہلی
جنگ عظیم سے پہلے کی بنی ہوئی سنگر مشین پر بنتو کی شلوار سی رہا ہے اور ادھر
دھنی رام پٹواری اپنی کھتونی میں اندراج کرتا ہے۔ یہ دھنی رام پٹواری پڑا حرامی ہے
بنتو کو دیکھ کر اس کی کھتونی کے اندراج غلط ہو جاتے ہیں اور یہ رام دین کے خلاف
سے دو کنال چودہ مرلے زمین نکال کر بنتو کے خانے میں درج کرتا ہے چلو انتقال

ہو گیا۔ سماۃ بنتو ولد چھن واس ذات کھتری ساکن موضع ــ ہائے: دھنی رام
کی آنکھ بھینگی نہ ہوتی تو کیا ہوتا ۔۔ ؟

یہ بنتو بڑی طرحدار لڑکی ہے۔ کنڈی دار سپلائی کے بنائے ہوئے پختہ حوض پر پانی بھرتے ہوئے جھگڑا کرتی ہے۔ اور اس کا یار کنڈی دار سپلائی کے ٹرک میں بیٹھا مسکراتا ہے بڑی پری لڑکی ہے جی یہ بنتو، اسے بھی گولی مار دیجئے۔

میں نے ابھی وہ تصویر مکمل نہیں کی ہے جس میں، میں نے ایک ہرا بھرا پنگھٹ دکھایا ہے ــ بنتو ڈول کھینچ رہی ہے اور کنڈی دار سپلائی کے ٹرک کا ڈرائیور اپنے دونوں ہاتھوں کی اوک بنا کر پیاسا ہے۔ اور بڑ کی ٹہنیوں سے جھولے لٹک رہے ہیں۔ اور بنتو کی سہیلیاں جھولوں پر بیٹھی گرہست بسنت ساون آیو رے گا رہی ہیں ــــ ایسے میں کیا ہوا جی: کہ دھنی رام پٹواری تھوہر کی جھاڑیوں کے پیچھے سے کھنکارا اور بنتو کے ہاتھ سے ڈول کی رسی پھسل گئی۔ اور ڈول ایک لمبی آہ بھر کر نیچے تہہ سے جا لگا۔

اور کھتونی میں اندراج ہوا کہ دھنی رام پٹواری کو تھوہر کی جھاڑیوں کے پیچھے ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا ــ مار دیجئے گولی دھنی رام پٹواری کو۔ بھلا کھتونی میں ایسی بات کا اندراج ہو سکتا ہے۔ ؟

بھونپو زور سے چیخ رہا ہے۔ بی بنتو! اٹھ۔ اری اٹھ جا نئے! پانی آگیا۔ کہاں آیا پانی ماں؟ یہ تو تیرے کان پر مچھر گنگنا رہے ہیں۔ بنتو کروٹ بدل کر چادر سر کے اوپر کھینچ رہی ہے۔ ٹرک کے ڈرائیور کا نام رام رکھا ہے ارے سچ ماں؟ پانی واقعی آگیا۔؟

اے گڑنندے : اسے کاٹر، یژبل ! فوگہ ینداہے ؟ تو تو پنڈ گوپیا ہے

چل ہٹ : آگ لگے تیری جوانی کو، ہر سے جملے تیں یہاں دو دو رہٹ

گھوما کرتے تھے۔ گھمر گھمرا اب تو یہ مواہمنٹ کا حوض چلتا ہے۔ دو ہفتے ہوگئے

نہائے ہوئے مگر یہ حوض نہیں گھومتا۔

گھوم جا ــــ

گھوم گیا ــــ !

تو کون ــــ ؟

رام رکھا ــــ

چل دفعان ہوجا جب دیکھو مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہے۔ ارے تو

کبھی کام کی بات بھی کرے گا یا یونہی بکتا جائے گا۔

ہجور! پنچوں کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔ پر ہجور ! میں نے اپنی ان دو آنکھوں

سے دیکھا حضور ــــ وہ بنتو ہے نا جی ؟ وہ دو گاگر پانی کے لے گئی۔ ارے

دہائی ہے پنچوں کی۔ سرکار یہ موا ایک آنکھ بھینگا ایک گاگر کی دو نہ دیکھے تو پھر

کون دیکھے ــــ ؟

مگر یہ تصویر مکمل نہیں ہو رہی۔ آخر کیسے مکمل ہوگی سالے گھنڈے تیری

منجھ کے بیچ ضرور کوئی خرابی ہے۔ دیکھ جگالی کر رہی ہے۔

ہے رام ! کیسا زمانہ آگیا ہے۔ رامائن میں ایسا شری کرشن مرار ی نے کہے

ہیں۔ تیری لیلا اپرم پار ــــ پورنماشی کی رات ہے۔ آکاش پر چندرما جا رہا

ہے اور ایودھیا پوری میں پیپل کے نیچے شری رام چندر جی راس لیلا رچا رہے ہیں

گڈریاں ناچ رہی ہیں ۔ بانسری کی تانیں اڑ رہی ہیں ۔

منتو : اری اٹھ ! دیکھو نہو بج رہا ہے ۔ پانی آگیا ہے ۔

کہاں آگیا ہاں ! ـــ یہ تو ـــ یہ تو ـــ

لے جندرہ رہ بیٹیا : تو منتو کا بڑا خیال رکھتا ہے یہ گوڑیاں تو ایسے ایک بوند تک نہ چلنے دیں ۔ ارے پٹواری : کیوں اپنی بے عزتی خراب کرتا ہے ۔ میں گورمنٹ کا آدمی ہوں ۔ تو بھی گورمنٹ کا آدمی ہے ۔ میرا تمہارا ساتھ تھا تو جنم جنمانتر کا ہے چل آ ۔ دو گھونٹ پانی کے پیتا جا ـــ

اچھا دید لگا رے ۔

انکھائیں ہمارے ۔

پانی دے ۔

ارے پانی دے !

ارے رام دئی ! تیرے آدمی کا کیا حال ہے ۔ سنا ہے کہ وید جی کہہ گئے ہیں بچنے کی کوئی امید نہیں ؟ ارے ہے لالہ بچنے کی امید تیرے ہوتے سوتوں کو نہیں ہوگی ۔ میرا آدمی تو جوان ہے جوان ۔ تیری طرح کوئی اسی سال کا کھوسٹ ہے ۔ اجل کم تھوکے ہی امانت دے جائے ۔

ہاں ہاں ہی ـــ تو بات ٹھیک سمجھتی ہے رام دئی

دیکھئے گولی رام دئی کو بھی ـــ بات اس تصویر کی ہو رہی ہے جسے میں مکمل کر رہا ہوں اس تصویر میں ایک جھر جھر کرتا ہوا جھرنا بہہ رہا ہے ۔ اور جھرنے کے کنارے پیپل کا درخت کھڑا ہے اور اس درخت کی شاخوں میں باد نسیم

اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ تجھے اٹھکیلیاں سوجھتی ہیں۔؟ جھرنے کے کنارے بنتو بیزار بیٹھی ہے۔ اور اُس کے ریشمی بالوں میں گلاب کی مہک بھر گئی ہے اور اُس کے ٹخنوں میں چھاگلیں بج رہی ہیں۔

:ننھا دھنی رام کی بھینگی آنکھ چیل کے جھپٹانے سے گر کر نرم نرم گھاس پر پلکیں جھپکنے لگی۔ اے بنتو رانی! ہم نے بھونپو کی آواز تو نہیں سنی بلبل ہٹ! بھونپو کا ہوتا سوتا۔ اتنے میں رام دئی نے تالی بجائی۔ اور دھنی رام کی بھینگی آنکھ پھیل گئی۔ اور چیل گر سائے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے آئی۔

اُف! یہ تو صبح ہی صبح گرمی کا حال ہے۔ دوپہر تک تو بدن پر آبلے پڑ جائیں گے۔ اتنے میں کیا ہوا جی! اک گنٹھی دار سپلائی کے ٹرک کا ڈرائیور رام رکھا آ گیا! اور بنتو کے ماتھے سے پسینہ ٹپکنے لگا۔ اور اس کا کلیجہ انجن میں موبل آئل ڈالتا رہا۔ یہ بنتو بڑی بے شرم ہے۔ الف ننگی کھاٹ پر لیٹی ہے۔

فضا میں دھواں اڑنے لگی اور چہروں پر چپک گئی جھونپڑوں کی مٹی کی دیواریں تپ رہی ہیں۔ اور رام دئی جو کے آٹے کی روٹیاں بنا کر ان دیواروں پر تھپا تھپ تھوپ رہی ہے۔ تنور ہے جی۔ پر یہ تو بہت تیرے کی اُپلے۔

میں سبز رنگ کہاں سے لاؤں؟ ابھی ان تیلیوں میں سبز رنگ بھرنا ہے۔ ابابیل کے جھپٹانے کے لیے سیاہی مائل گہرا سبز رنگ درکار ہے۔ اری بنتو! تو اٹھ کر سبز رنگ کی شلوار پہننا۔

ٹیاؤں ـــــ ٹیاؤں !!

چل ہٹ! سوکھے مڑیل خارش زدہ کتے! تو اپنی پتلی زبان گز بھر لٹکائے کس کا انتظار کر رہا ہے۔ ؟

لے بنتو اٹھ جا بیٹے! پانی آ گیا ہے ـــــ یہ بند گوپے کی منجھ سارا پانی پی جائے گی ـــــ پھر تو کس کے ساتھ بیاہ کرے گی۔ ہائے! کوئی دودھ سے بھی نہایا ہے۔ تیرا باپو اب تک اپنی زندگی میں صرف چھ بار نہایا ہے اور تیرا دادا تب نہایا تھا جب اسے شمشان سے جانے کے لئے سنوارا جا رہا تھا۔

ارے پٹواری جی! کیوں جلم کرتا ہے۔ میری بنتو تو ابھی بچی ہے تم اسے جی بھر کے نہانے تو دو ـــــ پھر یہ تیری جورو بنے گی۔ اور اور سبز رنگ کی شلوار پہنے گی۔

گہرا سبز رنگ کہو جی۔ یہ چلیے جلد کے چھتنائے ورنہ بتوں سے محروم ہو جائیں گے۔

سانپ!

کہاں ہے بے ـــ؟

ارے ادھر تھوہر کی جھاڑیوں میں

چپ رہ بیٹا! ان جھاڑیوں میں سانپ کب نہیں تھے۔ ہٹو ہٹو! کوئی سانپ نہیں ہے۔ یہ تو میں ہوں۔ کیوں ری بڑھیا؟

تم اب بنتو کو کچھ کھلاتی پلاتی نہیں؟ یہ اس کے گال مرجھا کیوں گئے ہیں

یہ اُس کے بالوں میں ساون کی گھٹائیں کیوں ہنس رہی ہیں — ؟

میں یہ مٹیالا، سوکھا بے رونق بے رنگ رو پہرہ کس برش سے بناؤں گا — ؟

اور میرے پیارے مسٹر ہر بھگوان جب پنگھٹ پر پنہاریوں کی قطار سروں پر چھم چھم کرتی گاگریں سجائے، ساون گاتی ہیں تو ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ میں زور دار لفظوں میں سفارش کرتا ہوں۔ کہ آپ یہ سین کیوا کلر میں خلمائیے ماسٹر پیس بن جائے گا۔

ٹے یوا کھتونی میں اندراج ہتا۔ کہ بندے کی بھنج گرمی کی شدت سے دم توڑ گئی۔

دم توڑ دینا گوبندے کی بھنج کا اور رکنا مر تکیوں کا ناچ جمنا کنارے!

اچانک کیا ہوا سجنو اور بھگوت پریمیو! کہ جمنا کے کنارے نٹ کھٹ انند لعل نے کنکریا مار کر ایک گوپی کا گھڑا توڑ دیا

ماں۔ یہ جمنا کا کنارہ کیا ہوتا ہے — ؟

ارے پر چپارہ! یا کتھا دیا کھیان میں ایسی بات نہیں کہتے۔ تم گوبندے کی ماں، جمنا کو جانتے ہو نا؛ بس رہی —

تو چپارہ رام دئی۔ تیرے مرد کا کلیان ہوگا۔ جگت کا کلیان ہوگیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جگت کلیان ہوگیا۔ اور تھوہڑ کی خاردار جھاڑیوں سے لمبے لمبے سانپ پھنکاریں مارتے ہوئے نکلے اور رام دئی کے پیٹ میں گھس گئے۔

بچاؤ!

بھوشپو زور سے چیخ اٹھا اور کنڈی دار سیلائی کے ٹرک نے اپنا منہ کھولا۔ اور گرم گرم بہہ چلی آئی بہہ کر تپتی ریت میں جذب ہو گیا۔

تم چپ رہو: خارش زدہ کتے چپکے مرلیٹے تھے سیٹ لگائی، پتلی سی گز بھر لمبی زبان کو۔ یہ ریت چاٹنے سے تیری پیاس تو نہیں بجھے گی؟ —

بی جنتو اٹھ! اری اٹھ مرجانے۔ پانی آگیا۔

ائے سچ ہاں؟ پانی واقعی آگیا ہے —؟

ارے ہیے گولی — پھر کس کس کے گولی مار دیئے۔

اُف: گولی مار دی گئی — یہ سرخی مائل مٹی کی دیواریں آگ برسا رہی ہیں۔ گرم ہواؤں کے جھکڑ چل رہے ہیں کھیتوں میں کھڑی سنہری رنگ کی بالی پسینے میں شرابور ہو رہی ہے۔ آسمان کی گدلاہٹ میں گدھ ناچ رہے ہیں۔

ارے مکھی رام! تم یہ لوگوں کے کپڑے کیوں پھاڑ رہے ہو —؟

آؤ: میرے کپڑے پھاڑ دو۔ مجھے تھوہر کی خاردار جھاڑیوں میں پھینک دو — اس خارش زدہ سڑیل کتے سے کہہ دو کہ میرا بدن چاٹے — اب پسینہ بھی نہیں بہہ رہا۔

آجا یدرا کالے۔

انگنا میں ہمارے۔

پانی دے :

ارے پانی دے !!

یکایک آسمان کی گڑگڑاہٹ سے ایک الشتر گر کر میرے سامنے ریزہ ریزہ ہو گیا۔ سارے اس تصویر کے ٹکڑے سمیت ذرہ ذرہ بیکنٹھ کے کل کل کرتی ہوئی ندیاں سرسراتے ہوئے چیل کے گھرے سے چھیر چھیر کرتا ہوا بیچ بستہ پانی کا جھرنا۔ چھم چھم کرتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں۔ زہ جوتے کے ٹخنوں میں چھا جھنجھن بج رہی ہیں۔ گویا دے کی مجھو دودھ دے رہی ہے اندری اودی گھٹائیں رم جھم برس رہی ہیں آم کے درختوں پہ بور آئی ہے

چھن ن۔

بیکنٹھ کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور ایسے میں کیا ہوا کہ کھمبہ ہو گئی جھاڑیوں میں سے ایک کالا لمبا، کبیا کا سانپ نکلا اور میرے گلے میں حمائل ہو گیا۔ اور تصورات کی پرچھائیاں ڈوب گئیں۔

ایک گھر اکھیا یک اندھیرا چاروں طرف سے ابھر رہا ہے مجھے کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا میں اندھا ہو گیا ہوں سچ میں اندھا ہو گیا ہوں۔

درگا! مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ مجھے اٹھا کر پٹاخے کی طرح بندہ کے منہ پر دے مارو، کیونکہ مجھے اپنے گاؤں میں کہیں بھی بیکنٹھ کا دروازہ نہیں مل رہا۔

●●

نیلے امبر تلے

نیڈوز ہوٹل کے بار روم میں جان ہیگ کا جام منہ سے لگاتے ہوئے
مراری لال ہندی ندالا نے سامنے بیٹھی مس چین ندالا کے خوبصورت چہرے
کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ——

"جانِ من: یہ گلمرگ کتنی پیاری جگہ ہے۔ دو ہفتے یہاں گزار کر میں
نے یہاں کے فارغ البال لوگوں کے رومان اپنی کتاب میں خوب مزے
لے لے کر لکھے ہیں ——

آج اس کتاب کا آخری حصہ ختم کروں گا —— بیرا ——"

اور جب بیرا آ گیا تو باہر چیل اور صنوبر کے درختوں کے اوپر سے چاند اپنا
تھکا ماندہ یرقانی چہرہ لئے نمودار ہو گیا

چاند کے نمودار ہوتے ہی ہوٹل کے سفید سفید اور مہین دوپٹوں نے ساری

پتھروں کو اپنی تہوں میں چھپا لیا۔ فضا میں نشہ سا انڈیل گیا۔ رگوں میں خون کی رفتار تیز ہو گئی۔ زلفوں میں مہک بھر گئی۔ بانہوں میں گداز اور لوچ پیدا ہو گیا

—— شاعر کے تخیل کی آخری منزل —— گلمرگ:

اور فیڈ ہونے سے کچھ ہی دور ممدو کے کٹھار میں خدیجی نے دیا جلا دیا۔

جس طاق پر یہ دیا جلایا گیا تھا وہ بہت ہی میلا کچیلا تھا۔ کڑوے تیل کی باس میں بسا ہوا —— اسی طاق کے نیچے ممدو کی ماں شاہمالی بیٹھے چرخہ کاتتی تھی۔ اور چرخہ کاتتے کاتتے دبی زبان میں کوئی پہاڑی گیت گنگناتی رہتی تھی۔ ان گیتوں میں گندا ہے پنے کی خوشی، شادی کا سنگار اور باپ کی مجبوریاں بکھری ہوتیں چرخے کی گھوں گھوں میں موسیقی کی ترمیاں ابھر ابھر کر ڈوب جاتیں اور شاہمالی اپنا گیت گاتے گاتے اونگھ جاتی۔ اونگھتے اونگھتے وہ خواب دیکھتی اور ان خوابوں میں کٹھار کے بجائے ایک مکان ہوتا —— کچی پکی اینٹوں کا بنا ہوا مکان۔ مکان میں پوتے اور پوتیوں کی کھلکھلاتی ہنسی ہوتی۔ آنگن میں بادام کا درخت ہوتا، اور درخت سے بندھے ہوئے چار پانچ بچھڑے ہوتے —— اور بس! جنت میں اتنی ہی چیزیں تو ہوتی ہیں —— اور کیا چاہیے!!

کبھی خواب دیکھتے دیکھتے شاہمالی چونک اٹھتی۔ اور مسکراتی آنکھیں جھپکاتی ہوئی خدیجی کی طرف دیکھ کر کہتی —— سن خدیجی! میں نے ایک خواب دیکھا ہے —— اور خدیجی ہنس دیتی: تم تو خواب ہی دیکھتی ہو روز —— کہہ کر اپنے کان باہر کسی آہٹ پر لگا دیتی —— جانی پہچانی

آہٹ جو صرف مردوں کے چلنے سے پیدا ہوتی تھی —
مگر یہ تو پہلے کی بات تھی۔ تب سے بہت کچھ بدل گیا تھا۔ شاہمالی خود ایسا
دیکھتے دیکھتے ان کی بھول بھلیوں میں اتنا کھو گئی تھی کہ اسے فکر کی تہوں سے
اتارنا پڑا تھا۔ تاکہ وہ ہمیشہ سوتی رہے۔ اور خواب دیکھتی رہے۔ اور اسے جگانے
والا کوئی پاس نہ ہو۔

شاہمالی کے مرنے کے بعد، شاہ بیگم کو یہ کبھی کبھار سونا سونا سا لگتا تھا۔ وہ
پہروں دروازے پہ بیٹھ کر دور دور میدان کے آس پاس گلیوں کو کھنڈروں کو
سبھی جھکتے دیکھا کرتی — ان عورتوں کو دیکھتی جو مردوں جیسا پوشاک پہنے
برف پر چلن کا کھیل کھیلا کرتی تھیں — ان بچوں کو دیکھتی جو چھوٹے موٹے
دستانے پہن کر اور ننھی منی جرابیں پہن کر برف کے گولے بنا کر تالیاں بجاتے تھے
— وہ دیر تک ان چیزوں کو دیکھتے دیکھتے ان میں کھو جاتی — حتیٰ کہ
اندھیرا اتر آتا۔ اور بچے اپنی ماؤں کے ساتھ چلے جاتے۔ عورتیں اپنے مردوں
کے کندھوں سے لگی چلی جاتیں — اور ٹٹو والے، اپنے ٹٹو سنبھالے چپ
چاپ اپنے ٹھکانوں کو لوٹ آتے — ان لوٹتے قافلوں میں اس
کا محمد بھی ہوتا، اپنے ٹٹو کی راس پکڑے ہوئے اور جیسے ہی وہ گھر میں داخل
ہوتا۔ تو وہ بچوں کے سے انداز میں مچل مچل کے پوچھتی — آج تمہارے
ٹٹو پر کون بیٹھا تھا محمد — ؟ وہ عورت تو نہیں جو مردوں جیسا پوشاک پہنے
تھی — ؟ وہ مرد تو نہیں، جو ٹٹو پہ بیٹھ کر تھر تھر کانپنے لگتا تھا — ؟ وہ
— وہ بچہ تو نہیں جس کے گال ٹماٹر کی طرح سرخ سرخ تھے — ؟

اور محمدو ـــــ دن بھر کا تھکا ہارا محمدو ـــــ اپنے پھٹے ہوئے پیروں کی طرف دیکھ کر جواب دیتا ـــــ خدیجی، آج کل کی روٹی پکی ہے یا نہیں ـــــ ؟ ـــــ اور خدیجی کے ذہن میں نیلی ہری تمام تصویروں کے رنگ خلط ملط ہو جاتے ـــــ اور پھر ایک ہی تصویر باقی رہ جاتی ـــــ مٹیالی سی دھندلی دار تصویر ـــــ جس میں ایک مریل سا ٹٹو ہوتا ـــــ ایک جھگی ٹوٹی ہوتی، ایک خوار سا گنوار ہوتا ـــــ اور ایک بھیانک لمبی اندھیری رات ـــــ

چاندنی اُس کونے سے اِس کونے تک بچھ گئی تھی ـــــ محمدو ٹٹو کے ساتھ دوڑتے دوڑتے بے دم سا ہونے لگا تھا۔ دوڑتے دوڑتے خدیجی کے الفاظ رہ رہ کے اُس کے کانوں میں گونج اٹھتے

" محمدو! آج جلدی آجانا ـــــ نہ جانے مجھے آج ڈر کیوں لگ رہا ہے ـــــ "

محمدو جانتا تھا کہ خدیجی نے یہ کیوں کہا ہے۔ ان دنوں اُسے خدیجی کا چھپا چھپا انداز اور شرمیلے تیور بہت اچھے لگتے تھے ـــــ ہائے کس انداز سے شرما کر بھاگ جاتی تھی۔ جیسے کسی نے چوری کرتے پکڑ لیا ہو ـــــ آج وہ کبھی گھر سے باہر نہیں آتا، اگر اس نے صاحب سے دو روپے پیشگی نہ لئے ہوتے ـــــ پھر وہ لحاظ کر کے کیسے انکار کر دیتا ـــــ ان

لوگوں کا مذہب، قانون، اور اقرار نامہ تو اسی لفظ پر قائم ہوتا ہے کیسے انکار کرتا آخر ——؟

آتی بار اس نے سوچا تھا کہ یہ دو گھنٹے یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے اور وہ خانصاحب کے پاس پہنچ جائے گا —— اور کسی تجربہ کار عورت —— کو لے آئے گا —— اور پھر ہر چیز آسان ہو جائے گی ——

دوڑتے دوڑتے اسے کئی بار خیال آیا کہ وہ صاحب سے کہے کہ وہ گھنٹے اس کے اندازے کے مطابق کب کے ختم ہو گئے ہیں —— مگر اس خیال سے کہ کہیں صاحب ناراض نہ ہو جائے اور ان دو روپیوں سے ہاتھ دھونا پڑیں وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

نہ جانے دو روپیوں کا خیال آتے ہی ہونٹوں پر مہر کیوں لگ جاتی ہے جانگر کہتے ہیں کہ پیسہ ہاتھ کی میل ہوا کرتا ہے —— مگر گلمرگ کی ہری بھری ڈھلانوں میں میل کا کیا کام ——؟ یہاں تازہ ہوا ہوتی ہے؛ ہری ہری گھاس ہوتی ہے —— چیل اور صنوبر ہوتے ہیں —— افق اور شفق ہوتے ہیں۔ چاندی کے جزیرے ہوتے ہیں —— یہاں میل کا کیا کام ——؟

ممدو نے تصور کے ہاتھوں سے اپنی جیبیں ٹٹولیں مگر ان دو روپیوں کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا —— اور پھر اسے اچانک خیال آیا کہ اس نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا —— چاول ختم ہو گئے تھے اور دکاندار نے ادھار دینے سے انکار کیا تھا —— کون سیزن ختم ہوتے ہوتے کسی

کو اُدھار دے اور وہ بھی گلمرگ میں ـــــ؛ اُسے خیال آیا کہ ٹٹو کا چارہ بھی ختم ہو گیا ہے ـــــ یہ سب چیزیں تو تب ہی آتی ہیں جب دن بھر کچھ کمایا جائے۔

"صاحب!" ممدو نے آخر کار اپنے لب کھول دیئے۔

"کیا ہے ـــ؟" صاحب نے گھوڑے پر ہی بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

"کیا ہے ــ؟؟" آس پاس کی پہاڑیوں نے بیک زبان پوچھا ـــ

"صاحب! وقت کیا آیا ہوگا ــــ" ممدو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"دس بج گئے ہیں ـــ" صاحب نے بے خیالی میں جواب دیا۔

"صاحب! پھر تو دو گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ـــ آپ تو پورے آٹھ بجے ہی گھوڑے پر بیٹھے تھے ـــ"

"ابھی کہاں ہوئے ممدو گھنٹے پورے کیسے ـــ" صاحب کو غصہ آگیا۔

"صاحب! میری گھر والی بیمار ہے۔" ممدو نے بیچارگی سے کہا

"بیمار ہے تو میں کیا کروں ــــ؟" پہاڑیوں میں گونج پیدا ہو گئی۔

"صاحب! اُسے سخت تکلیف ہو گئی ہے ـــ مرنے کا خطرہ ہے"

"مرنے والوں کو کون روکتا ہے ــ بے؟"

"کون روکتا ہے ــ بے؟!" پہاڑیوں نے للکارا

"اچھا صاحب! میرا نہیں تو کم از کم گھوڑے کا ہی خیال کیجئے ——— مر جائے گا بے چارہ ———"

"پیسے نہیں دئے ہیں تم نے ——— ؟ گھوڑا مر جائے تو میں اس کے لئے ذمہ دار ہوں ——— ؟؟ ———"

ممدو ایک پتھر پر سر پکڑ کے بیٹھ گیا ——— اور زندگی میں پہلی بار ——— یا شاید دوسری بار یا تیسری بار یا سویں بار۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی بس گئی۔ اور دھندلا گئیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی دھیرے سے کراہ اٹھا ہے۔ در اصل تو یہ اس کے کانوں میں گونج پیدا ہو گئی ———

"مرنے والوں کو کون روکتا ہے بے!!"

بغیر سوچے سمجھے وہ چلایا ——— "صاحب! صاحب!!! اپنے دو روپے واپس لیجئے۔ میں نے گھوڑا دو گھنٹوں کے لئے دیا تھا۔ ساری رات کے لئے تو نہیں دیا تھا ——— واپس لیجئے یہ دو روپے ———"

دوسرے لمحے ممدو کے چہرے پر چابک لہرایا۔ اور ایک لکیر کھنچ گئی، کان کی لو سے کر ہونٹ کے کونے تک ——— چابک دوسری مرتبہ لہرایا اور خون کی پتلی سی دھار بہہ گئی ———

"جاہل ——— کمینے!"

"جاہل ——— کمینے!!" پہاڑیاں چیخ اٹھیں

"سارا موڈ خراب کر دیا ——— لا دو روپے اور دفعان ہو جا ——— کل صبح ہوتے ہی میں تمہاری شکایت کر دوں گا ——— ہاتو کے بچے ———"

"ہاتھ کے نیچے ---" خون کی پتلی سی لکیر بول پڑی

"جاہل --- کمینے : ---" جنت کے سیاح نے آواز دی

ممدو نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ٹومی کی طرف دیکھا جو نتھنے پھلا ہانپ رہا تھا اور اپنے مالک کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

دیا جلا کر خدیجی چرخے کے سامنے بیٹھ گئی --- اس چرخے پر کبھی شاہمال بیٹھا کرتی تھی۔ اور خواب دیکھتی تھی۔ اور گنگنایا کرتی تھی --- آجکل خدیجی بیٹھا کرتی تھی --- اور ایسے خواب دیکھا کرتی تھی کہ جن کی تعبیریں نہ جانے کہاں کھو گئی تھیں اور ایسے گیت گاتی تھی جن کے بول نہ جانے کس جنت کی کہانیاں سناتے تھے۔

چرخے کے پاس بیٹھ کر خدیجی کا درد اور بڑھ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے اس درد کو فراموش کرنے کی بہت کوشش کی پر نہ جانے یہ کیسا درد تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا --- آج وہ اپنے کمہار کے دروازے پر بیٹھی دور پرے میدان کے آس پاس ٹہلتے والوں کو نہ دیکھ سکی تھی۔ آج وہ ان ننھے منھوں کی طرف بھی نہ دیکھ سکی تھی جو ہمیشہ اس کے ذہن کے دریچوں میں موجود رہتے تھے۔

آج --- آج نہ جانے کیوں ان دریچوں کے پٹ کھل گئے تھے۔

آج نہ جانے کیوں اِن دریچوں میں کلیلیں سی بس گئی تھیں ـــــ کل سے ایسا ہی تھا۔ برسوں سے ایسا ہی تھا ـــــ آخر یہ خوشی آئندہ چل کیوں سما گئی تھی، ہواؤں میں ـــــ ؟ کون آرہا تھا آخر ـــــ ؟ ؟

اللہ ! یہ کیسا مہمان ہے جو آنے سے پہلے اتنی ساری چیزیں بھیج رہا ہے ـــــ ؟ خدیجہ اس خیال سے شرما گئی ـــــ

اور یکایک وہ درد کی شدت سے تڑپ گئی جیسے ابابیل بجلی چمکنے پر تڑپ جاتی ہے۔ ـــــ اور پھر اُس کے ذہن میں بسی ہوئی بہت پرانی تصویروں کے رنگ خلط ملط ہو گئے۔

محمود ! آج تمہارے مُنہ پر کون بیٹھا تھا ـــــ ؟ وہ بچہ تو نہیں جس کے گال ٹماٹر کی طرح سُرخ سُرخ اور چھوٹے چھوٹے ہیں ـــــ ؟

کیا سب ہی بچے ایسے ہی ہوتے ہیں ـــــ ؟ کہاں ہوتے ہیں ایسے سبھی بچے ! نوری کا بچہ تو بس سوکھا سوکھا مریل سا لگتا ہے ـــــ جیسے آنتیں باہر نکل آئی ہوں ـــــ کیا میرا بچہ بھی ـــــ ؟

خدیجہ ایک بار پھر درد سے کراہ اٹھی۔ ساتھ : یہ محمود کیوں نہیں آرہا ہے کتنی دیر لگا دی آنے میں ـــــ تاکید تو کی تھی میں نے جلدی آنے کی ـــــ اور محمود کے بارے میں سوچتے سوچتے خدیجہ کو خواہ مخواہ اُس پر پیار آگیا ـــــ ابھی تھکا ہارا آئے گا، اور کھانا مانگے گا ـــــ پھر میں کیا کروں ؟ یہ موا درد تو میری رگ رگ سے جان نکال رہا ہے ـــــ ہائے ! اوہ !! میں مر گئی ـــــ !!!

جانتی ہو خدیجی —— ؟ پر تمہیں کہاں معلوم ہوگا —— خیر سنو، جس دن ممدو پیدا ہوا تھا، اُس دن بہت طوفان آرہا تھا —— ممدو کا باپ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا ٹٹو کے ساتھ —— شاید آپ چلا گیا ہو، یا شاید کھلن مرگ تک ہی —— مجھے درد شروع ہو گیا —— اکیلی تھی اس کٹھار میں —— کوئی بھی آس پاس نہیں تھا —— پھر —— مجھے سخت درد تھا، میں نے مارے درد کے اپنا ہاتھ کاٹ کھایا —— یہ زخم کا نشان دیکھتی ہو نا. یہ وہی نشان ہے۔ پھر مجھے بے ہوش ہو گئی۔ نہ جانے کتنی دیر کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں —— تو ممدو کا ابا میرے سرہانے بیٹھا رو رہا تھا۔ اور خدیجی کیا بتاؤں —— ؟ گل گوتھنا سا ممدو میری چھاتی سے لگا چپڑ چپڑ دودھ پی رہا تھا۔

ارے! یہ شاہمالی کہاں سے بول رہی ہے؟ کیا قبر سے آوازیں واپس آتی ہیں —— ؟ اُف! ارے!! یہ کیا ہو رہا ہے جیسے —— ؟ درد تھوڑا کم ہو جائے تو میں —— ممدو نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا ہے دن بھر ٹٹو کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے جان نکل جاتی ہے۔

مگر یہ زلزلہ —— ؟

یہ کٹھار کیوں گھوم رہا ہے —— ؟ یہ دیواریں کیوں ہل رہی ہیں —— ؟ ارے! یہ چراغ کس نے گل کر دیا ہے —— ؟ یہ اندھیرا کیوں بڑھ رہا ہے۔ ممدو! ممدو!! مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

—— مجھے نیند آرہی ہے —— تم کہاں ہو ممدو؟

مجھے نیند آرہی ہے ــــــ

ڈھیلم کوئی منحوس کتا بھونک رہا تھا ــــــ

ممدو نے ٹٹو کمہار کے دروازے پر باندھ دیا اور اندر چلا گیا۔ اندر

اندھیرا گھور رہا تھا ــــــ

"خدیجی ــــــ" اس نے ہلکے سے آواز دی ــــــ کوئی نہیں بولا

"خدیجی ــــــ!! ممدو نے قدرے زور سے پکارا ــــــ

"دیا کیوں نہیں جلایا ہے ری ــــــ؟"

اچانک کسی نوزائیدہ بچے کی پہلی چیخ ــــــ یا دوسری یا تیسری چیخ

فضا میں ابھر آئی ــــــ ممدو کا دل بیٹھ گیا۔ اور پھر زور زور سے دھڑکنے

لگا۔

"خدیجی! تم کہاں ہو ــــــ؟ یہ ــــــ یہ کون چیخا ہے ــــــ؟"

اس نے تھرتھرائی آواز میں پوچھا، اور اندھیرے میں اسے

ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا ــــــ گرتے پڑتے اس نے دیا سلائی کی ڈبیہ ڈھونڈھنے

کی کوشش کی۔ ٹٹولتے ٹٹولتے ممدو کے ہاتھ کسی نرم گرم چیز سے مس

ہوئے۔ اندھیرے میں اس نرم گرم چیز نے حرکت کی اور ساتھ ہی دوسری

چیخ فضاؤں میں پرواز کر گئی ــــــ اس کے بعد نرم گرم چیز نے باقاعدہ

رونا شروع کیا۔

" خدیجی! تم بولتی کیوں نہیں آخر یہ سب کیسے ہو گیا ــــ؟ کب ہو گیا؟"

ممکنہ اپنی آواز پر چونک پڑا ــــ یہ میری آواز نہیں ہو سکتی ــــ میری آواز کو کیا ہو گیا ہے ــــ؛ جیسے کسی نے زبان پر انگارہ رکھ دیا ــــ اسی وقت ممکنہ کے ہاتھ دیا سلائی کی ڈبیہ سے ٹکرا گئے

" سرر" ایک تیلی جل کے بجھ گئی ــــ اُس نے جلدی میں دوسری تیلی جلائی ــــ وہ بجھ گئی ــــ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے ــــ اُس نے ایک اور تیلی جلا کر دیا روشن کیا۔ ــــ اور ساتھ ہی اُس کی چیخ نکل گئی ــــ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا ــــ

" خدیجی! میں کسی کو لے آؤں گا ــــ نہ ــــ وہ غلام کی ماں ــــ ہاں نہ ٹھیک رہے گی ــــ! اُسے ان باتوں کا تجربہ ہے ــــ" ممکنہ نے چہرہ ڈھانپے ہی پوچھا ــــ پھر وہی اجنبی آواز یہ میری آواز تو نہیں ہے ــــ یہ میری آواز کو کیا ہو گیا ہے ــــ

خدیجی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ممکنہ نے ایک ہاتھ سے اُسکے کندھے کو دھیرے سے ہلایا ــــ اور ساتھ ہی اُس نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ خدیجی برف کی مانند سرد تھی ــــ سرد اور بے حس ــــ

دُور نہ جانے کتنا دستور بھونک رہا تھا۔ گلمرگ کی وسیع وادیوں میں چاندنی رقص کی مستیوں میں تھی۔ اور ململ کے مہین دوپٹے خموشیوں میں بدستور سرسرا رہے تھے۔

ہیڈ ویٹر کے بار روم میں چاؤں ہنگ کا چھٹا جام منہ سے لگاتے ہوئے شری مراری لال ملہوترا نے اپنی کرسی آتشدان کے قریب کھینچ لی —— اور اپنے آپ سے بڑبڑانے لگا۔

یہ گلمرگ! ہپ!! کتنی پیاری جنت ہے۔ یہاں عمدہ شراب ملتی ہے —— ہپ!! اس پر بھی یہاں کے لوگ خوش نہیں —— جاہلوں کی اولاد —— ہپ!! شراب، محبت، حسن —— میری کتابوں میں کیا کچھ نہیں ہوگا۔ —— ہپ!!! —— "

بیرا ——!

اور چند لمحوں کے بعد جب بیرا آگیا تو ہیڈ ویٹر سے کچھ ہی دور رماوند کے کمرے میں میلے سے طاق پر رکھا ہوا دیا ہوا کے ایک ہی جھونکے سے بجھ گیا۔ اور رماوند نے سوچا اب یہ دیا کبھی روشن نہیں ہوگا۔ اس طاق کے نیچے چرخے کے پاس اب کوئی گیت نہیں گنگنایا جائے گا۔ اب کسی تصویر کے

رنگ۔ اخلاط ملط نہیں ہوں گے۔ اب کوئی بچہ اپنی آیا کی گود میں نہیں ہمکے گا ——
کیوں کہ خدیجہ بی جنت کی فضاؤں کو ٹھکرا کر چلی گئی ہے ——
اُس نے اپنے پچھلے —— اور آخری بچے کو گود میں اٹھا لیا ——
کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کی ناف کو کپڑے کے ایک ٹکڑے سے
باندھ دیا —— اور پھر اُسے گود میں لے کر، چپکے چپکے ہولے ہولے رونے
لگا۔

نازلی

o

تانزلی سے مجھے ایک خوبصورت قسم کی میٹھی میٹھی سی شکایت ہے
اور جس دن یہ شکایت دور ہوگی آپ اس کہانی کو بھول چکے ہوں گے

اس شکایت کی کہانی اس زمانے سے شروع ہوتی ہے جب میں
انگلینڈ میں سیلزمین تھا!

انگلینڈ کی مشہور فرم میں الگ الگ کاؤنٹر تھے اور ہر کاؤنٹر پر ایک
ایک سیلزمین ہوا کرتا تھا۔ جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ اور یہ شاید مسٹر شیلے
کے دماغ کی اختراع تھی۔ کہ جس کاؤنٹر پر مردوں کے کام کی چیزیں رکھی
تھیں وہاں پر لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ اور جس کاؤنٹر پر عورتوں کے کام کی
چیزیں تھیں۔ اس پر مرد کام کرتے تھے! یہی وجہ ہے کہ میں عورتوں کے
سامانِ آرائش کے کاؤنٹر پر تھا۔ جسے میں جمالیاتی کاؤنٹر کہا کرتا تھا۔ اور میرے
بازو والے کاؤنٹر پر جہاں مردوں کے استعمال کی چیزیں فروخت ہوا کرتی تھیں

میری ہم کار نازلی کی حکومت تھی۔ نازلی کے کاؤنٹر پر "ٹائی پن" سے لے کر "فلی تھیو" تک مردوں کے استعمال کی ہر چیز تھی۔ اور میرے کاؤنٹر پر ڈبی بمعہ فتیلی سے لے کر سپر ٹان تک عورتوں کے کام کی ہر چیز تھی۔ میرے کاؤنٹر پر عموماً کالج کی لڑکیاں اور سوسائٹی گرلز آتی رہتی تھیں۔ اور نازلی کے کاؤنٹر پر کالج کے لڑکے، پی ڈبلیو ڈی کے کلرک گشتی رنڈوے اور ہوٹلوں میں ملازم دل پھینک جانے پہچانے کھڑے نظر آتے۔ اُن دنوں ایلی گنس میں بڑا رش رہتا تھا کیونکہ وہاں قریب قریب تمام چیزیں میڈ اِن انگلینڈ تھیں جنہیں ہندوستانی عورتیں اور مرد زیادہ پسند فرماتے ہیں۔ فرصت کے وقت اور خاص کر جس وقت مسٹر سنیلے کا بھاری بھرکم وجود دوکان میں نہ ہوتا تھا میں اور نازلی اس مسئلہ پر دیر تک باتیں کرتے کہ ہندوستانی عورتیں اور مرد خاص انگلستانی چیزیں کیوں پسند کرتے ہیں لیکن اس بات پر میں اور نازلی کبھی متفق نہیں ہوئے۔ خیر اس بات کو فی الحال جانے دیجئے۔ ویسے نازلی اور میں کسی حد تک دوست ضرور تھے۔ یہ دوستی صبح نو بجے سے لے کر شام کے نو بجے تک قائم رہتی اور اس کے بعد دوسرے دن صبح نو بجے تک کے لئے ختم ہو جاتی تھی۔ یہ عجیب ماڈرن قسم کی آفیشل دوستی تھی۔ صبح سویرے گڈ مارننگ سے شروع ہو کر شام کو گڈ نائٹ پر ختم ہو جاتی تھی۔ اور اس سو فیصدی میڈ اِن انگلینڈ دوستی پر میں اندر ہی اندر کڑھتا، بل کھاتا، بھنووں کو سکیڑتا لیکن ساتھ ہی ساتھ خدا کا شکر بجا لاتا کہ نازلی جیسی خوبصورت لڑکی سے کم از کم دوستی تو ہے۔

اس دوستی کا ایک لطیف پہلو یہ بھی تھا کہ ہم دونوں غیر شادی شدہ تھے اور شادی کے بارے میں ہم دونوں کے خیالات اور ارادے جدا جدا تھے۔ نازلی کسی ایسے آدمی کے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی جو بہت مالدار ہو۔ ذرا بھی خوبصورت نہ ہو۔ بلکہ تھوڑا سا بدصورت بھی ہو۔ اور میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو بے حد خوبصورت ہو، پڑھی لکھی ہو اور انگریزی شاعری کی دلدادہ ہو۔

نازلی کے ان خیالات کے پس منظر میں صرف یہ بات تھی کہ وہ انتہائی غریبی کے دن دیکھ چکی تھی۔ اور اس نے ایلی گنس میں نوکری کرنے سے پہلے خالی پیٹ سونے کا بھی مزہ چکھا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ نوکری سے پہلے اسے اپنی گلی کا ایک آوارہ مزاج شرابی دادا دل ہی دل میں اپنی منگیتر بنانے کا قصد کر چکا تھا۔ ویسے میں نے بھی بہت کچھ نشیب و فراز دیکھے تھے۔ اور کئی مرتبہ سوچتے سوچتے رہ گیا تھا کہ خودکشی کرنا گناہ کیوں قرار دیا گیا ہے جب کہ یہ کبھی کبھی ایک نعمت سے کم نہیں!

مجھے ایلی گنس میں ایک پادری کی وساطت سے نوکری مل گئی تھی جو خدا ترس آدمی تھا اور جس کی بات جس کے لیے شاید ہی کبھی ٹالا کرتی تھی۔ اور نازلی محض اپنی خوب صورتی کے سرٹیفکیٹ پر رکھ لی گئی تھی۔ ویسے نازلی تھی بہت طرحدار۔ بقول ایک گشتی رزمیہ کے جو ہر سنیچر کو نازلی کے کاؤنٹر پر موجود ہوتا تھا۔ نازلی کا جسمانی جغرافیہ ونڈرفل تھا۔ کاؤنٹر پر کھڑی ہوتی تو کسی قلوپطرہ کا گمان ہوتا تھا۔ بات کرتے کرتے گردن ذرا ایک طرف جھکا دیتی تو ہیلن کے متعلق لکھی ہوئی وہ نظم یاد آجاتی ...

...... WAS THIS THE FACE

لیکن میں یہ نظم بھی نہ گنگنا سکتا تھا۔ کیوں کہ میں مجبور تھا۔ اور نازلی بھی مجبور تھی۔ وہیں سے ہم صرف آتشیں دوستی پر قانع رہا کرتے تھے۔ میں اپنی ہلین کا انتظار کر رہا تھا اور نازلی اپنے ہنری فورڈ کا انتظار کر رہی تھی۔ اور اس باہمی مفاہمت نے ہمیں بہت زیادہ پریشان ہونے سے بچا لیا تھا۔

میں اپنے کاؤنٹر پر کسی نئے عطر کی شیشی دیکھتے ہوئے سوچا رہتا تھا کہ اگر نازلی میری ہوتی۔ تو میں اپنی نصف تنخواہ صرف کر کے اس کے لئے عطر کی یہ شیشی لے آتا۔ تاکہ اس کی خوشبو سے وہ مدہوش ہو جائے۔

ایک دن میں نے نازلی کو ایک خوبصورت ٹائی سے بے خیالی میں کھیلتے ہوئے دیکھا۔ اور جب اُسے محسوس ہوا کہ میں اُس کی یہ حرکت دیکھ رہا ہوں تو اس کے گالوں کے سیب گلنار ہو اٹھے۔ اُف! وہ بھی نہ جانے کن خوابوں سے گلا گھونٹ رہی تھی جس اپنے اُن دیکھے، انجانے ہنری فورڈ کی خاطر۔ اور میں بھی نہ جانے کن سپنوں کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ فقط اپنی مجبوری کے چیتھڑے تنکے ہائے! یہ زندگی کتنی پیچیدہ ہے اور انسان کتنا سادہ لوح!

ایک دن میں نے سادہ لوحی میں نازلی سے پوچھا۔

"نازلی! اگر شادی کے بارے میں یہ خیالات نہ ہوتے جو ہیں تو تم اپنے لئے کیسا جیون ساتھی پسند کرتیں؟"

اور نازلی نے معصومیت سے جواب دیا۔

"میری پسند وہی ہوتی جو میرے ماں باپ کی پسند ہوتی"

اور میں یہ سوچ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس مغربی فرم میں یہ مشرقی ذہن کیا

سمجھی ـــــــ ؟"

زندگی اسی طرح چوری چھپے گذر رہی تھی۔ کہ نازلی پر ایک مصیبت نازل ہو گئی۔ اس دن لنچ کے وقت میں دکان سے باہر جانے لگا تھا کہ نازلی کا چہرہ دیکھ کر رک گیا۔ اس چہرے میں آج تفکرات کے سائے لرز رہے تھے۔

"کیا بات ہے ڈیر؟"

میں نے پوچھ لیا۔

اور میرا یہ جملہ سن کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے بغیر کوئی جواب دیئے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ خط اس کے باپ کا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ ان لوگوں نے نازلی کے لئے ایک رشتہ منظور کر لیا ہے۔ لڑکا خوبصورت ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ اور نوکری بھی کر رہا ہے۔ یہ بھی لکھا تھا کہ اگر نازلی چاہے تو اسے دکھانے کو لڑکے کا فوٹو منگوایا جا سکتا ہے۔

میں نے خط پڑھ کر لفافہ نازلی کو واپس کر دیا۔ جی میں تو آئی کہ کہہ دوں، بہت کچھ کہہ ڈالوں، مگر میں کچھ نہ کہہ سکا۔ کبھی کبھی خود اپنی آنا سے ڈر لگتا ہے۔ میں اس وقت بھی ڈر گیا۔ اس لئے کچھ نہ کہہ سکا۔ اور دوسرے لمحے میں دکان سے باہر چلا آیا۔

باہر آکر مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کے چراغ کو ہتھیلی پر رکھ کر ایک ہی پھونک سے بجھا دیا ہو۔ اور پھر میرے آگے پیچھے کی دنیا اندھیری ہو گئی۔

میں جانتا تھا کہ نازلی کے باپ کے پاس دولت نام کی کوئی چیز نہیں

ہے۔ نہ جانے اُس نے بیٹی کی شادی کا بندوبست کیونکر کیا ہے۔ مگر اس کا کیا؟ ہو ہی جایا کرتا ہے بیٹی کی شادی کا بندوبست۔ کبھی مکان بیچ کر اور کبھی ایمان بیچ کر۔ غریب آدمی کے پاس ان دو چیزوں میں سے ایک چیز ضرور ہوتا ہے لیکن میں نے نازلی سے یہ بات نہ پوچھی۔ ہمت ہی نہ ہوئی پوچھنے کی۔

نازلی دن بھر بجھی بجھی سی اپنے کام میں مصروف رہی۔ میں بھی سہما سہما اور پریشان رہا۔ شام کو جب ہم جانے لگے تو قاعدے کے مطابق ہماری دوستی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن پھر بھی ہم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے نازلی؟"

میں نے پوچھ ہی لیا

"سوچنا کیا ہے، جو ہو گیا سو ہو گیا!" نازلی نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی!"

"مگر تمہارے خیالات، میرا مطلب ہے شادی کے بارے میں جو تمہارے ارادے تھے اُن کا کیا ہوا؟"

"ارادے بدلنے پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی۔"

"پھر تم کیوں نہیں بدلیں؟ تمہارے چہرے پر یہ فکرمندیاں کیسی ہیں؟ تمہارے سراپا میں یہ اداسی کیسی ہے؟ تمہاری آنکھوں کا یہ انتظار کیوں نہیں گیا؟"

میں نہیں کہنا چاہتا تھا یہ باتیں۔ لیکن کہہ ہی گیا۔ جذبات کی ہلچل! نازلی چلتے چلتے رک سی گئی۔ اُس نے مجھے عجیب سی نگاہوں سے گھورا۔

"یہ تمہارا وہم ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو؟ میں بے وقوفوں کی طرح دریا میں کود

کر جان نہ دے دیتی؟ پہاڑ سے ٹکرا کر مر جاتی؟ میں نے پانچ برس اپنے ہنری فورڈ کا انتظار کیا ــــ اب اور کتنا انتظار کروں، کیا عمر بھر ــــ؟

"ــــ مگر نازلی یہ سراسر زیادتی ہے۔ تمہارے ماں باپ کو تم سے پوچھ تو لینا چاہیئے تھا۔"

نازلی کی آواز کی شدت ذرا کم ہو گئی۔ چند لمحوں تک نہ بالکل خاموش رہی پھر اس نے دھیرے سے کہا۔

کیا تم ان سے یہ بات EXPECT کرتے ہو؟ وہ لوگ پرانی روایتوں کے قائل ہیں۔ بھلا ان معاملوں میں کبھی لڑکی سے بھی پوچھا جاتا ہے؟" اُف نازلی ان چند ہی گھنٹوں میں کتنی بدل گئی تھی ــــ "تم تصویر بھی تو دیکھ سکتی ہو!"

"میں لڑکی ہوں آفتاب صاحب! میں نے گھر لکھ دیا ہے کہ انہوں نے یہ جملہ لکھ کر میرا دل دکھایا ہے۔"

یہ تو کوئی دوسری لڑکی تھی جو ایسے بول رہی تھی۔ نازلی کا یہ رُخ تو آج تک مجھ سے پوشیدہ تھا۔ میں دم بخود رہ گیا۔

"تم اپنے آپ کو تباہ کرو گی نازلی!"

"انسان صرف اپنے آپ ہی کے لئے نہیں جیتا ہے۔ دوسروں کے لئے بھی زندہ رہتا ہے۔ اور پھر میرے ماں باپ اب بوڑھے ہو چکے ہیں وہ مجھ سے کوئی غیر معمولی حرکت برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

نازلی نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس کے بعد میں نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن دل میں طوفان

بدمعقول ہنستے رہے۔ اس واقعہ کے بعد میں شاید ایلی گنس کو خیرباد کہتا لیکن نازلی کے اور میرے درمیان جو باہمی مفاہمت کار فرما تھی۔ اس نے ساری بات کو قابلِ برداشت بنا لیا۔ دراصل اپنے اپنے تحت الشعور میں ہم دونوں نے ناگزیر کو جگہ دی تھی۔ اس لئے نازلی کی اور میری دوستی برابر قائم رہی۔ وہی بارہ گھنٹوں کی اتفاقی دوستی۔

اس واقعہ کے بعد نازلی میں یکسر تبدیلی آگئی۔ وہ اب اپنے کاؤنٹر کے پاس کسی دولت مند بڈھے کو دیکھ کر سراپا پیار بن جانے کی بجائے اپنے چہرے پر سنجیدگی کا خول چڑھائے سو فیصدی سیلز گرل بن جاتی تھی۔ خود مجھ میں بھی ایک بڑی تبدیلی سرگرم عمل تھی۔ میں اب حد سے زیادہ کم گو بننے لگا تھا۔

نازلی کی شادی میں دس بارہ دن رہ گئے تھے۔ ایک دن مجھے گھر سے تار ملا۔ لکھا تھا، ماں سخت بیمار ہے۔ آخری بار دیکھنے کے لئے فوراً چلے آؤ۔ تار پڑھ کر میرے چہرے پر نہ جانے ایسی کون سی کیفیت پیدا ہو گئی جسے دیکھ کر نازلی دوڑی دوڑی آئی۔ اور تار میرے ہاتھوں سے چھین لیا۔

"اوہ ـــــ" اس نے صرف اتنا کہا۔ اس ایک اشارے میں وہ بہت کچھ کہہ گئی۔ تار لے کر وہ مسز اسٹینلے کے پاس گئی اور میری رخصت منظور کرا کے میرے ساتھ اسٹیشن تک چلی آئی۔ میں تمام راستے میں خاموش تھا۔ کیوں کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن نازلی بولتی رہی اسے دکھ ہو رہا تھا کہ میں اسکی شادی پر نہ آ سکوں گا۔ اسے دکھ ہو رہا تھا۔ کہ میں نے آج تک اپنی ماں کی بات کو دو مرتبہ ٹالا تھا اور شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے اس بات کا بھی دکھ ہو رہا تھا۔ کہ میں نے [illegible] کیا تھا

یہ نازلی نہیں بول رہی تھی۔ ایک عورت بول رہی تھی جس کے دل میں کئی طرح کا پیار ہوتا ہے۔ اور ہر طرح کے پیار کا ایک والہانہ انداز ہوتا ہے۔ یہ عورت کے خون میں بسی ہوئی ممتا بول رہی تھی جسے ہر مرد پیدائش سے لے کر موت تک اپنے بہت قریب محسوس کرتا رہتا ہے۔ مختلف حالات میں، مختلف رنگوں میں مختلف انداز میں۔

میں نے اس طاقت کی شدت کو محسوس کیا مگر خاموش رہا۔ میں نازلی کو بیک وقت بہت قریب اور بہت دور محسوس کر رہا تھا جب گاڑی چلنے لگی۔ تو نازلی ایک ننھا سا سفید رومال نکال کر ہلانے لگی۔ رومال ہلاتے ہلاتے اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ اس مسکراہٹ نے مجھ سے کچھ کہا۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

جب میں گھر میں داخل ہوا تو میں سیدھا ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ مگر ماں وہاں موجود نہ تھی۔ وہ رسوئی میں بیٹھ کر آٹا گوندھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اور میری حالت دیکھ کر وہ پہلے مسکرائی۔ اور پھر اس کی دونوں آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برسنے لگیں۔ جب بادل چھٹ گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ میری ماں بیمار نہ تھی بلکہ یہ ایک ڈھونگ تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ میری شادی طے ہو گئی تھی۔ بلکہ طے کی گئی تھی۔ اور یہ سوچ کر کہ میں حسبِ معمول انکار نہ کر بیٹھوں مجھے دھوکے سے بلوایا گیا تھا۔

مجھے شدید غصہ آ گیا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے نازلی کی باتیں بھی یاد آ گئیں۔
" انسان صرف اپنے آپ ہی کے لئے نہیں جیتا ہے، دوسروں کے لئے

بھی زندہ رہتا ہے !"

کوئی نسوانی ہاتھ سفید رومال ہلا ہلا کر مجھے یاد دلا رہا تھا۔ اور میں منزل کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ وہ پلین نہ جانے کب آ گئے۔ نہ جانے کب آئے میں شادی کے لئے رضامند ہو گیا۔

جس دن دلہن گھر میں آ گئی اُس دن بہت چہل پہل تھی سب مجھے رہ رہ کر نازلی یاد آ رہی تھی جانے اُس کا دولہا کیسا ہو گا۔ میں نے دیکھا مُنی میری چھوٹی بہن مارے خوشی کے آسمان سر پر اٹھا رہی تھی۔ میں نے اُسے گود میں لے کر پچکارا۔

"کیوں روتی ہو مُنی ؟"

"مجھے دلہن کا نام بتا دو !"

"میں کیسے بتاؤں ؟"

"پھر مجھے کون بتائے گا ؟"

"تمہیں کیا کرنا ہے نام جان کر ؟"

"واہ کرنا کیوں نہیں۔ میں وہ نام سلیٹ پر لکھ کر اُسے دکھاؤں گی۔ کتنی خوش ہو جائے گی وہ چوتھی جماعت میں پڑھتی ہوں جی !"

"تو جا کر اُسی سے پوچھ لو۔ پھر سلیٹ پر لکھ کر مجھے دکھانا !"

مُنی تالیاں بجاتی ہوئی عورتوں کے جھرمٹ میں کھو گئی۔

میں باہر دالان میں کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

نازلی کے بارے میں سوچنے لگا۔

"اُس کی بھی شادی ہو گئی ہو گی !"

اتنے میں منی سلیٹ لے کر سامنے آگئی ـــــ سلیٹ پر ٹیڑھے میڑھے
حروف میں لکھا تھا۔

"سلمیٰ نیازی ـــــ الیاس نازلی آفتاب"

میں نے سلیٹ اس کے ہاتھوں سے چھین لی۔ میں پاگل ہو گیا۔

نازلی نے یہ بات مجھے بہت دنوں کے بعد بتائی کہ اس نے شادی سے
پہلے ہی خط لکھ کر فوٹو منگوایا تھا ـــــ اور مجھے اس سے یہ شکایت ہے کہ اس نے
مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا ـــــ؟

اُف! ـــــ یہ عورت ذات !!

●●